اپریل 2015، قیمت 10 ₹

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

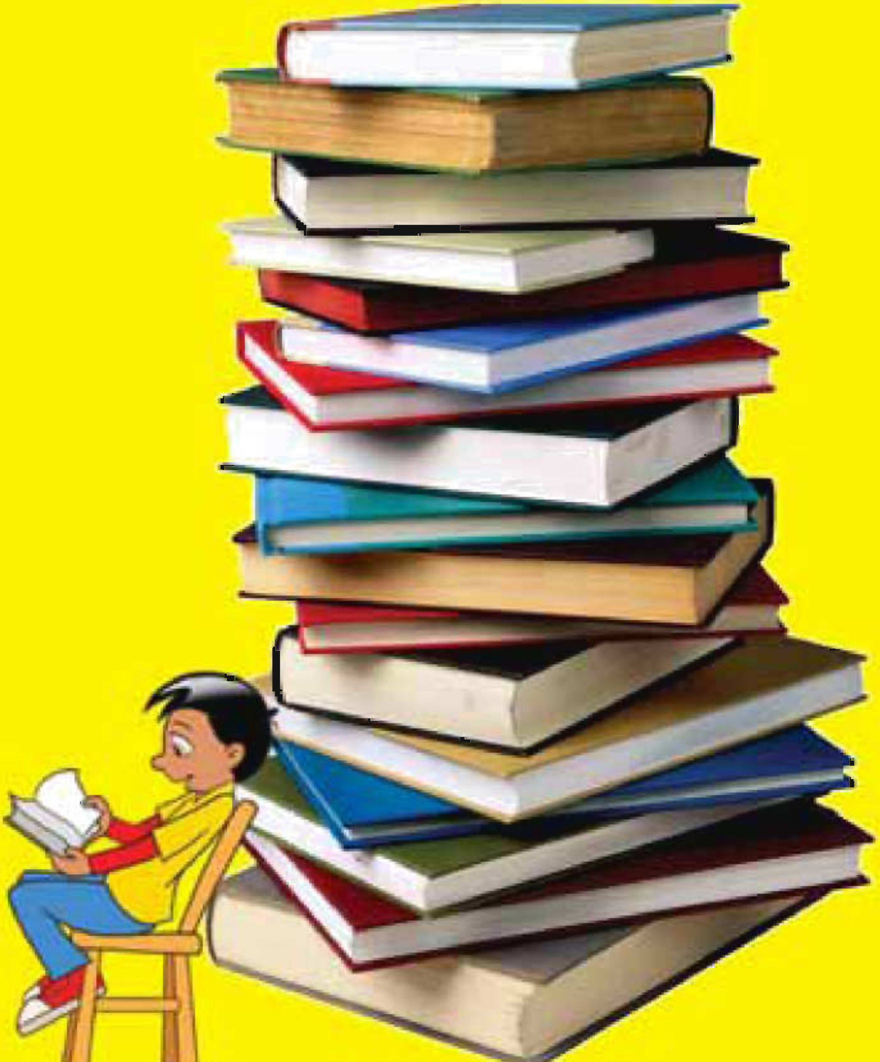

کتابیں سب سے اچھی دوست

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھئے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اس شمارے میں

بچوں کی دنیا

جلد:3 شمارہ:4 اپریل 2015

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	4
نظم	مرا ابکرا	ظفر کمالی	5
کہانیاں	ظلم	سیّد لطف اللہ گورکھپوری	6
	چالاک درزی	صدر عالم گوہر	10
	گوریا کی ہنسی	پرویز اشرفی	13
	جنگلی چوہا	ترجمہ: مسعود منوّر	16
	بادشاہ کا ایلچی	ترجمہ: نصر ملک	19

سائنس کی الف لیلہ	پھکری کی حیرت انگیز کہانی	ترجمہ: انیس الدین ملک	23
اپنے وطن میں	راجستھان کا آبو پربت	ڈاکٹر نریش	29
کامکس کہانی	ننھے ریچھ کی اچھی باتیں	ادارہ	33
نانی کا صندوق	چھن چھن کرتی آئی چڑیا	شیلندر	41
ڈرامہ	بے وقوف دولہا	عظیم اقبال	42
نظم	ہمارا اسکول سب سے پیارا	علیم صبا نویدی	46

قسط وار ناول	رابنسن کروسو-5	ڈینئل ڈیفو	47
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	57
اردو فیس بک	بچوں کی باتیں	ادارہ	61
انٹرنیٹ سے	انوکھے منظر	ادارہ	62

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون 49539000
شعبۂ ادارت 11-49539009
ای میل
bachonkiduniya @ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
شعبۂ فروخت: فون: 26109746
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،
نئی دہلی-110066
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں
شاخ 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

آپس کی باتیں

لیجیے صاحب، سالانہ امتحان بھی پورے ہوئے۔ بس اب بارہویں کے بعد کے امتحانات باقی ہیں۔ امید ہے آپ سبھی کے پرچے اچھے ہوئے ہوں گے، اور اب گرمی کی چھٹیوں کے شروع ہونے کا انتظار چل رہا ہوگا۔ سالانہ امتحان کی کڑی محنت کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں کسی تحفے سے کم نہیں ہوتیں۔ بچے ان چھٹیوں کو گزارنے کے لیے طرح طرح کے پلان بناتے ہیں۔ خوب صورت جگہوں کی سیر کرتے ہیں۔ دوسرے شہروں یا دیہات میں رہنے والے رشتہ داروں کے یہاں جاتے ہیں۔ پکنک مناتے ہیں۔ کھیلتے کودتے ہیں۔ ٹی وی دیکھتے ہیں۔ موبائل پر فیس بک، ایس ایم ایس اور دوسری سوشل سروسز کو زیادہ وقت دینے لگتے ہیں۔ غرض یہ کہ تقریباً سبھی بچے خوب موج مستی میں چھٹیوں کے دن گزارتے ہیں۔

مگر ایک کام ایسا ہے جو سالانہ چھٹیوں میں بچے عام طور پر بالکل نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے بھی ہیں تو اسے کم سے کم وقت دیتے ہیں۔ یہ کام ہے کتابوں کا مطالعہ! اور آج ہم اسی بارے میں کچھ باتیں کریں گے۔

دوستو، پچھلے پچیس تیس برسوں میں ٹیکنالوجی نے زبردست ترقی کی ہے۔ ریڈیو کی جگہ ٹیلی ویژن آ گیا ہے۔ ٹیلی ویژن پر دوردرشن کے صرف ایک چینل کے ساتھ اب سیکڑوں چینل آ گئے ہیں جو دن رات تقریباً ہر موضوع پر اچھے اچھے پروگرام ٹیلی کاسٹ کرتے ہیں۔ اسی طرح ٹیلی فون کی جگہ موبائل فون نے لے لی ہے اور آج چھوٹا بچہ بھی موبائل فون کی شکل میں پوری دنیا کو مٹھی میں لیے پھرتا ہے۔ موبائل پر آپ نئے نئے دوست بناتے ہیں۔ دور دراز رہنے والوں سے نہ صرف بات کر سکتے ہیں بلکہ انھیں بات کرتے ہوئے دیکھ بھی لیتے ہیں۔ گھر بیٹھے اپنے من پسند پیزا Pizza یا دوسرے سنیکس Snacks وغیرہ کا آرڈر دے سکتے ہیں۔ ٹرینوں کا وقت اور ریزرویشن کی تازہ ترین پوزیشن معلوم کر سکتے ہیں۔ اس سے بھی بڑا انقلاب کمپیوٹر کی شکل میں آیا ہے جس نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ کمپیوٹر ہر طرح کی معلومات کا ذریعہ بن گیا ہے۔ انٹرنیٹ پر ویب سائٹ کے روپ میں کئی بڑے سرچ انجن دن رات آپ کی خدمت کے لیے موجود رہتے ہیں جو آپ کے حکم پر ہر طرح کی معلومات آپ کو مہیا کرا سکتے ہیں۔ ریلوے ریزرویشن سے لے کر بینکنگ اور آن لائن شاپنگ تک روزمرہ زندگی کے سیکڑوں چھوٹے بڑے کام کمپیوٹر انگلیوں کے ایک اشارے پر کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ ٹیلی ویژن، موبائل اور کمپیوٹر کے ٹیکنالوجیکل انقلاب نے ہماری زندگی کو نہ صرف آسان بنا دیا ہے بلکہ بہت سی چیزوں کی ضرورت بھی ختم کر دی ہے۔ مثلاً، آڈیو ریکارڈنگ اور آڈیو پلے انگ کے نئے اوزاروں، پین ڈرائیو، میموری اسٹک اور ایکسٹرنل ہارڈ ڈسک کے آنے سے گراموفون ریکارڈ کی ہی نہیں سی ڈی اور ڈی وی ڈی کی ضرورت بھی ختم ہو گئی ہے۔ ڈجیٹل ریکارڈنگ نے وی سی آر کو میدان سے ہٹا دیا ہے۔ ڈجیٹل کیمرے فوٹو فلم کو دکانوں سے غائب کرا چکے ہیں۔ ای میل کی سہولت نے فیکس مشینوں کو بیکار کر دیا ہے۔ کمپیوٹر ٹائپنگ نے ٹائپ رائٹر کا استعمال بند کرا دیا ہے۔ لیکن کتاب ایک ایسی چیز ہے جس کی اہمیت اور ضرورت اس کے باوجود بدستور قائم ہے کہ کمپیوٹر اسکرین پر پڑھنے کے لیے لاکھوں کتابیں ویب سائٹوں نے اپ لوڈ کر رکھی ہیں اور ای بکس کی یہ تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ بلکہ اب تو کتاب کو خود پڑھ کر سنانے والے سافٹ ویئر بھی بازار میں آ گئے ہیں جن میں پڑھنے والے یا والی کی آواز بھی آپ خود چن سکتے ہیں اور اس کے پڑھنے کی رفتار بھی گھٹا بڑھا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود کتابیں خوب چھپ رہی ہیں، جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھیں آپ بیٹھ کر یا لیٹ کر کسی بھی طرح کا بجلی وغیرہ کا خرچ کیے بغیر پڑھ سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کتابوں سے اچھا کوئی دوست نہیں۔ وہ آپ کو پڑھنا ہی نہیں سوچنا بھی سکھاتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر آپ دوسروں کو ہی نہیں خود کو بھی جان سکتے ہیں۔ اس لیے میں یہی صلاح دوں گا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں زیادہ سے زیادہ وقت کتابوں کو دیجیے، اپنی پسند کی کتابیں لائبریری یا بازار سے حاصل کیجیے، انھیں اپنائیے، اپنا دوست بنائیے۔ پھر دیکھیے، چھٹیوں کا کیسا مزا آتا ہے! آپ کا دوست

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

ظفر کمالی

مِرا بکرا

مرا بکرا نہیں پڑھتا ہے میں اس کو پڑھاؤں گا
اسے عالم بناؤں گا اسے فاضل بناؤں گا

اسے ٹوپی پنھاؤں گا اسے چشمہ لگاؤں گا
اگر پڑھنے میں روئے گا تو میں اس کو ہنساؤں گا

بڑا پیارا ہے یہ بکرا کروں گا دوستی اس سے
کبھی دوں گا اسے ٹافی کبھی بسکٹ کھلاؤں گا

وہ لٹکائے ہوئے گردن میں بستہ جائے گا پڑھنے
میں اپنے ساتھ ہی اسکول میں اس کو بٹھاؤں گا

زمانہ ہے یہ انگلش کا تو پڑھ لے گا وہ انگلش بھی
اسی کے ساتھ اردو اور ہندی بھی سکھاؤں گا

یہ جب مغموم ہوگا میں کروں گا اس کی دل داری
سنائے ہیں مجھے دادی نے جو قصے سناؤں گا

کبھی بیٹھے بٹھائے جب شرارت سوجھ جائے گی
مجھے وہ گدگدائے گا میں اس کو گدگداؤں گا

سکھاؤں گا اسے بلاّ پکڑنا اپنے دانتوں سے
میں کرکٹ ساتھ اس کے خوب کھیلوں گا کھلاؤں گا

سُلا کر اس کو گدّے پر بٹھا کر اس کو صوفے پر
کبھی گانا سناؤں گا کبھی ٹی وی دکھاؤں گا

سکھادوں گا اسے میں کس طرح گاتے ہیں قوّالی
وہ 'میں میں' کر کے گائے گا تو میں ڈھولک بجاؤں گا

پلاؤ مرغ کو کیوں سونگھ کر وہ چھوڑ دیتا ہے؟
یہ کھانا مولوی کھاتے ہیں میں اس کو بتاؤں گا

کرے گا اپنی ٹانگیں جوڑ کر پرنام لوگوں کو
اسے میں شہر لے جاؤں گا گلیوں میں گھماؤں گا

اگر اسٹیج پر تقریر کرنا سیکھ جائے گا
تو بکرستان کا بکرے کو میں پی ایم بناؤں گا

بڑا ہو جائے گا جب وہ بندھے گا اس کو بھی سہرا
کسی بکری سے اس بکرے کی میں شادی کراؤں گا

مری کوشش یہی ہے گھر رہے آباد بکرے کا
کہیں چھوٹے بڑے سارے مجھے استاد بکرے کا

Dr Zafar Kamali Ismail Shaheed (M M Colony) Mill Road, Siwan -841226

سید لطف اللہ گورکھپوری

ظلم

مَلِک طفیل احمد نے اپنے والد کے انتقال کے بعد شہر میں کپڑے کا ایک کارخانہ کھڑا کرلیا، جس میں بنے کپڑے کی ڈیزائننگ اور چمک دمک نے ایسی دھوم مچائی کہ خود مَلِک صاحب حیران رہ گئے۔ کپڑوں کی ڈیمانڈ اتنی بڑھی کہ سال بھر کے اندر انہیں دوسرا کارخانہ لگانا پڑا۔ اس طرح بڑی تعداد میں بے روزگار نوجوانوں کو اپنی مِلوں میں کھپا کر انہوں نے نہ صرف ان کی روٹی روزی کا مسئلہ حل کیا، بلکہ اپنے شہر کو دوسرے ترقی یافتہ شہروں کی فہرست میں شامل کرانے کا سہرا بھی اپنے سر بندھوالیا۔

دراصل مَلِک صاحب کا تعلق زمینداروں کے پرانے گھرانے سے تھا۔ ملک میں زمینداری کے خاتمے کے بعد ان کے والد نے تجارت کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی محنت اور ذہانت سے صابن، بلیڈ اور اون کی ایجنسی کے ذریعے اتنی دولت کمائی کہ اس کی مدد سے انہوں نے ہینڈلوم کے کپڑے بنانے والا ایک بڑا کارخانہ قائم کیا اور پھر اس کارخانے کی مدد سے ان کے لائق فرزند مَلِک طفیل احمد نے شہر میں سال بھر کے اندر دو ملیں قائم کردیں اور ان کا شمار ملک کے بڑے صنعت کاروں میں ہونے لگا۔

مسلسل بڑھتی جارہی کپڑوں کی مانگ کو دھیان میں رکھ کر مَلِک صاحب نے کپڑے کی تیسری مل قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور جدید ترین مشینوں کا جائزہ لینے کے لئے انہوں نے جرمنی اور جاپان جانے کا پروگرام بنایا۔ روانگی کی تاریخ طے ہونے کے بعد انہوں نے اس کی اطلاع اپنے دوست شہباز خان کو بھی دینا ضروری سمجھا۔

''ہیلو شہباز کیسے ہو؟ میں دو ہفتے کے لیے تجارتی دورے پر جرمنی اور جاپان جارہا ہوں۔ آج رات کو ایک بجے میری فلائٹ ہے۔''

''نہیں! اتنی بڑی خبر اور اتنی تاخیر سے؟''

''دراصل جانے سے پہلے ساری اہم فائلوں کو نپٹانا بہت ضروری تھا اور پھر ان میں ایسا الجھا کہ کچھ ہوش ہی نہ رہا۔''

''خیر! بہت بہت مبارک ہو۔ کامیابی تمہارا مقدر بنے اور تم کامیاب ہوکر لوٹو۔''

''ہاں دعا کرو کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک طریقے سے انجام پاجائے۔''

''اور سنو مَلِک! تمہارے اس سفر سے میری ایک بڑی مشکل

آسان ہوگئی ہے، بلکہ ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

’’وہ یہ کہ میرا ڈرائیور پچھلے ایک ہفتہ سے بیمار پڑا ہوا ہے، جس کی وجہ سے سارے ضروری کام رک گئے ہیں، اگر اپنی ناموجودگی میں تم اپنا ڈرائیور میرے یہاں بھیج دو تو تمہارا بڑا احسان ہوگا۔‘‘

’’اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ اس دوران میرا ڈرائیور خالی ہی رہے گا۔ میں اسے تمہارے وہاں بھیج دوں گا۔ وہ کل صبح تمہاری کوٹھی پہنچ جائے گا۔‘‘

دوسرے دن صبح مِلک صاحب کا ڈرائیور بشیر، شہباز خاں کے یہاں پہنچا تو پہلے سے اس کے انتظار میں بیٹھے شہباز نے اسے ایک لسٹ، کچھ نوٹ اور ایک تھیلا پکڑاتے ہوئے کہا ’’ابھی گاڑی سے تو کہیں نہیں جانا۔ بس ذرا بازار چلے جاؤ اور وہاں سے ان چیزوں کو لیتے آؤ، جو لسٹ میں درج ہیں۔‘‘ یہ سن کر بشیر کو غصہ آگیا اور اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مگر پہلے ہی دن جھگڑا کر لینے کے بجائے اس نے صبر سے کام لینا اور بازار سے سودا لے آنا زیادہ مناسب سمجھا۔ کوٹھی سے باہر نکل کر اس نے پکڑائی لسٹ پر ایک نظر ڈالنا ضروری سمجھا۔ لکھا تھا:

1۔ کتے کا راتب — آدھا کلو
2۔ انڈے — چھ عدد
3۔ بکرے کا گوشت — تین پاؤ

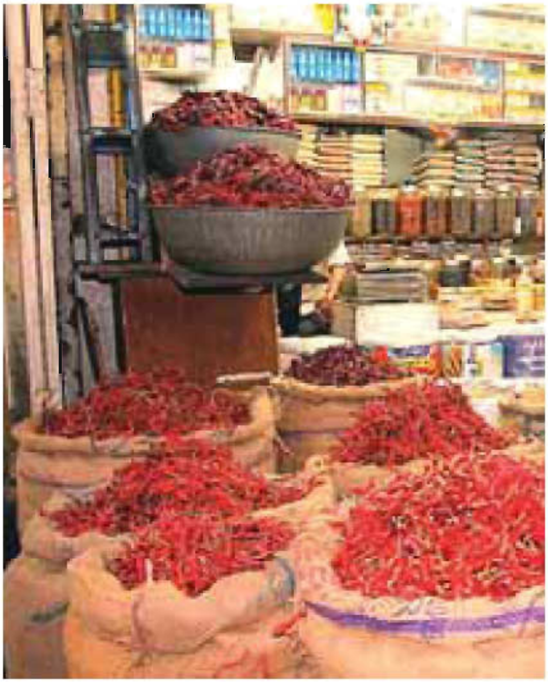

4۔ چینی — ایک کلو
5۔ چائے کی پتی — ڈھائی سو گرام
6۔ مکھن — سو گرام
7۔ چقندر — دو سو گرام
8۔ نیبو — ایک عدد
9۔ صابن — ایک عدد

اگلے دن جب بشیر شہباز خان کی کوٹھی پر پہنچا تو انہوں نے پہلے دن کی طرح پھر اسے ایک لسٹ پکڑا دی، جسے دیکھ کر غصے سے اس کی ساری رگیں تن گئیں، مگر کوئی بدمزگی پیدا کرنے کے بجائے، اس نے صبر و تحمل سے کام لیا، اور بازار سے وہ ساری چیزیں لاکر دے دیں، جو لسٹ میں درج تھیں۔ مگر تیسرے دن بھی جب یہی ڈرامہ دہرایا گیا تو اس کی قوت برداشت جواب دے گئی، اس نے شہباز خان کے ہاتھوں میں دبی لسٹ لینے سے انکار کردیا اور بولا ’’دیکھیے صاحب! میں ڈرائیور ہوں، آپ کا گھریلو ملازم نہیں۔ میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔ روز روز بازار سے آپ کا سودا سُلف نہیں لاسکتا۔ اس کے لیے آپ الگ

سے ملازم رکھ لیجیے۔‘‘

یہ سن کر شہباز خان کا منہ کھلا کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چند لمحوں تک سکتے کی حالت میں رہنے کے بعد اچانک ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو اٹھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسے گولی سے اڑا دیتے۔ منہ سے جھاگ ابلتے ہوئے بولے ’’دو ٹکے کا ڈرائیور مجھ سے زبان لڑاتا ہے، میں تیرا وجود مٹا دوں گا۔ لوٹ کر آنے دے مَلِک صاحب کو پھر میں تیرا حشر دیکھ لوں گا۔ اب یہاں کھڑا کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ نکل جا میری کوٹھی سے ابھی اور اسی وقت اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ بدتمیز کہیں کا۔‘‘

اس بے عزتی پر بشیر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ وہاں سے لوٹ کر مَلِک طفیل احمد کی کوٹھی پر اپنی ڈیوٹی دینے لگا۔

واپس آنے کے بعد جب مَلِک طفیل احمد موبائل پر اپنے دورہِ جرمنی اور جاپان کی روداد سنا رہے تھے تو اپنی داستانِ غم سنانے کے لیے بے چین شہباز خان بار بار پہلو بدل رہے تھے اور جیسے ہی مَلِک صاحب نے اپنی بات ختم کی شہباز خان خان شروع ہو گئے۔

’’یار مَلِک تمہارا ڈرائیور تو بہت گستاخ نکلا، اس نے میری ایسی بے عزتی کی کہ اس سے پہلے کسی اور نے نہ کی تھی۔ کہتا ہے میں کتے کا راتب نہیں لاسکتا۔ اس کام کے لیے کسی اور کو ملازم رکھ لیجیے۔ میں نے تیسرے ہی دن اسے اپنے یہاں سے باہر کر دیا تھا۔ وہ میرے کسی کام کا نہ تھا۔‘‘

’’اس سے ایسی امید تو نہ تھی، بہرحال اس کی بدتمیزی سے جو اس نے تمہارے ساتھ کی، میں بہت شرمندہ ہوں۔ تم فکر نہ کرو میں آج ہی اسے ملازمت سے برطرف کیے دیتا ہوں۔‘‘ گفتگو کا سلسلہ کاٹ کر مَلِک صاحب نے گھنٹی بجا کر اپنے اکاؤنٹنٹ کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ بشیر کی تین دن کی تنخواہ بطور جرمانہ کاٹ کر باقی دنوں کی تنخواہ دے دی جائے اور اسے اسی وقت ملازمت سے برطرف کر کے شام تک کسی مہذب اور مؤدب ڈرائیور کا انتظام کیا جائے۔‘‘

لگ بھگ دو ماہ بعد جب ملک صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے مختلف مقامات سے آئی ہوئی ڈاک دیکھ رہے تھے ایک آواز ان کے کان سے ٹکرائی۔ انہوں نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ پھر اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر اسی آواز نے ان کا پیچھا کیا۔ ’’مَلِک تم نے اپنے ڈرائیور کے ساتھ زیادتی کی ہے۔‘‘

’’میں نے؟‘‘ مَلِک صاحب نے حیرت سے پوچھا، ’’مگر تم کون ہو؟‘‘

’’نہیں جانتے؟ میں تمہارا ضمیر ہوں۔ تمہارا محتسب۔ تم شیطان کو گمراہ کر سکتے ہو۔ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہو، لیکن میری پہنچ اور پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔ تم نے اپنے ڈرائیور بشیر کو صفائی کا موقع دیے بغیر، اپنے دوست کی یک طرفہ شکایت پر نوکری سے برطرف کر دیا اور اس کی تین دن کی تنخواہ بھی ناجائز طور پر کاٹ لی، جبکہ اس نے ان دنوں میں تمہارے دوست کے ہاں ڈیوٹی بھی کی تھی۔ تمہارا قدم قدرتی انصاف کے تقاضوں کے خلاف تھا، اور تم خدا کی نظر میں مجرم ٹھہرتے ہو۔‘‘ یہ سن کر مَلِک صاحب کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ انہیں بشیر کے ساتھ ہوئی ناانصافی کا احساس ہونے لگا۔ انہوں نے موبائل کا نمبر گھما کر ڈرائیور راحل کو بلایا اور اس سے کہا کہ ابھی بشیر کے گھر جاؤ اور جا کر کہو کہ وہ اسی وقت چل کر اپنی تین دن کی تنخواہ لے لے۔

’’تم نے اپنے ڈرائیور بشیر کو صفائی کا موقع دیے بغیر، اپنے دوست کی یک طرفہ شکایت پر نوکری سے برطرف کردیا اور اس کی تین دن کی تنخواہ بھی ناجائز طور پر کاٹ لی، جبکہ اس نے ان دنوں میں تمہارے دوست کے ہاں ڈیوٹی بھی کی تھی۔ تمہارا قدم قدرتی انصاف کے تقاضوں کے خلاف تھا، اور تم خدا کی نظر میں مجرم ٹھہرتے ہو۔‘‘ یہ سن کر مَلِک صاحب کے ماتھے پر پسینہ آگیا

راحل کے منہ سے مَلِک صاحب کا پیغام سن کر بشیر بھڑک اٹھا اور تلخ لہجے میں بولا ’’میں اپنی تین دن کی تنخواہ لینے کے لیے وہاں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ قیامت کے دن جب ہر شخص کو خدا کے سامنے اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا اور جس دن مَلِک صاحب کی ملیں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہوں گی اور جس دن ان کی جیب میں اپنا قرض ادا کرنے

کے لیے ایک پیسہ نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی دوست ان کا مددگار ہوگا، اس دن میں مَلِک صاحب کو اپنی تین دن کی تنخواہ کے بدلے تین سو روپے میں خریدوں گا، یہی بات جا کر مَلک صاحب سے کہہ دینا۔''

راہل کی زبانی بشیر کے الفاظ سن کر مَلِک صاحب اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ وہ میز پر پڑی ڈاک کو ایک جھٹکے سے الٹ کر کھڑے ہو گئے اور دفتر سے نکل کر پیدل ہی بشیر کے گھر کی طرف چل دیے۔ ان کی بدحواسی دیکھ کر ان کے مِل کے کچھ ملازمین بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اس وقت بشیر اپنے دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ اس نے مَلِک صاحب کو دیکھ کر ادب سے انہیں سلام کیا اور اندر آنے کا اشارہ کر کے خود بھی گھر کے اندر چلا گیا۔ اس نے مَلِک صاحب کے سامنے ایک کرسی لا کر رکھی، مگر کرسی پر بیٹھنے کے بجائے مَلِک صاحب بشیر کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں مَلِک صاحب۔'' بشیر تقریباً چیخ پڑا۔ مگر مَلک صاحب پر اس کی چیخ پکار کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے فطری لہجے میں بولے ''میں گنہگار ہوں، تمہارا قرض دار ہوں، تمہاری برابری نہیں کر سکتا۔ میں تم سے معافی مانگنے اور یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ اگر تم اپنی تین دن کی تنخواہ معاف کر سکو تو میں اپنی ایک مِل تمہارے نام لکھنے کے لیے تیار ہوں''

''نہیں مَلِک صاحب! نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے آپ کی دولت یا مِل نہیں چاہیے مجھے عزت اور انصاف چاہیے اور آج کے دن خدا کو گواہ بنا کر میں اپنی تین دن کی تنخواہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کے سر کے اوپر سے معاف کرتا ہوں۔''

بشیر کے اس فیصلے سے مَلِک صاحب کی مشکلیں اور بڑھ گئیں۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تھکے تھکے قدموں سے واپس اپنے دفتر کی طرف چل پڑے۔ چلتے چلتے ان کے لبوں پر ایک ہی افسوس بھرا فقرہ تھا، ''بڑا ظلم ہوا!''

ملازمین بھی اپنے دفتر کی طرف لوٹنے لگے۔ ▫

Syed Lutfullah
Sangi Masjid, Sheikhpur, Gorakhpur - 273005 UP

محمد صدر عالم گوہر

چالاک درزی

عزیز میاں ایک درزی تھا۔اس کی کاریگری کے ایک زمانے میں چرچے ہوا کرتے تھے۔اس جیسا کپڑا علاقے میں کوئی نہیں سیتا تھا بڑے بڑے امیر رئیس اس کے یہاں کپڑے سلوانے آتے تھے۔یا اسے اپنے یہاں بلوا کر اس کو اپنا ناپ اور کپڑے دیتے جس کے عوض عزیز میاں کو منہ مانگی رقم ملتی تھی۔شہر کے تقریباً سارے درزی یا ٹیلرنگ ہاؤس والے عزیز میاں کے شاگرد تھے۔اس لیے شہر کے سارے درزی عزیز میاں کو نام سے نہیں پکارتے تھے۔بلکہ عزت سے مخاطب کرتے تھے۔اور یہی اعزاز ان کے لیے کافی تھا کہ سارے درزی تو استاد کہتے ہی تھے شہر کے لوگ بھی اب انہیں استاد ہی کہنے لگے تھے۔

تبدیلی وقت کا مقدر ہے۔دنیا میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔انسان کی قسمت بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ہمیشہ کسی کے دن ایک جیسے نہیں رہتے۔عزیز میاں کی زندگی میں بھی تبدیلی آ گئی۔عزیز میاں کی دکان پر پرانے اور اکا دکا لوگ ہی جاتے تھے۔کیونکہ اب جو کپڑوں کی ڈیزائن تھی وہ پہلے سے مختلف تھی۔اب لوگ نئے فیشن کے کپڑے سلواتے تھے جو نوجوان ٹیلر سیتے تھے۔ویسے تھے تو سب عزیز میاں کے شاگرد مگر دلّی ممبئی جا کر نئے نئے ڈیزائن اور نئے فیشن کی کٹنگ سیکھ کر آ گئے تھے۔اور شاندار قسم کا ٹیلرنگ کی دوکانیں کھول لی تھیں۔ان کی سجاوٹ بھی نئے ڈھنگ کی تھی۔دوکانوں پر روشنی کا

خوب اہتمام کیا گیا تھا اس لیے ہر دوکان شام ہوتے ہی کسی بڑے شہر کی دوکان کی طرح لگتی تھی۔ ایک نہیں کئی دوکانیں اس طرح کی کھل گئی تھیں جن پر لوگوں کی خوب چہل پہل رہتی تھی اور یوں ان دوکانوں کی آمدنی خوب بڑھ گئی تھی۔ لیکن عزیز میاں پرانی روش پر ہی قائم تھے۔ بوڑھے بھی ہو چکے تھے اس لیے لڑکے اور جوان ان کی دوکان پر کم ہی آتے تھے۔ صرف کچھ بوڑھے پرانے گاہک ہی ان کی دوکان پر آتے تھے جس سے ان کے یہاں سلائی کا کام کم ہو گیا تھا۔ آمدنی گھٹ گئی تھی کام کم ہو جانے کی وجہ سے انھوں نے پہلے کچھ سلائی مشین بیچ دی کیوں کہ سلائی کرنے والے کاریگر سب اب ان کی دوکان چھوڑ کر دوسری بڑی اور نئی دوکانوں پر جانے لگے تھے۔ آخر تھک ہار کر عزیز میاں نے اپنی بڑی دوکان بیچ دی اور ایک چھوٹی دوکان لے کر بیٹھ گئے جس میں وہ اکیلے سلائی کا کام کرتے تھے۔

عزیز میاں کو بلّی پالنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہمیشہ ایک بلّی پالتے تھے اور بلّی کو دوکان پر ہی رکھتے تھے۔ ایک میلی کچیلی کٹوری تھی جس میں کچھ دودھ رکھ دیتے تھے۔ اور بلّی پیتی تھی۔ بلی ادھر ادھر نہ بھاگ جائے اس لیے وہ بلی کو ایک زنجیر سے باندھ کر رکھتے تھے۔ ادھر بلّی

زنجیر سے بندھی دودھ پیتی اور کھیلتی کودتی تھی ادھر عزیز میاں اپنے کام میں لگے رہتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے ایک انگریز سیاح ادھر سے گزرا۔ اس نے عزیز میاں کی دوکان پر دیکھا کی ایک بلّی ایک کٹورے میں دودھ پی رہی ہے۔ انگریز نایاب اور پرانی چیزوں کا پارکھی تھا۔ اس نے کٹورے کو دیکھا اور سمجھ گیا یہ نادر و نایاب Antique کٹورا ہے اور بہت قیمتی ہے۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں اس کی قیمت بہت زیادہ ہوگی۔ اس نے سوچا کہ اگر کٹورا خریدنے کی بات کروں گا تو دوکاندار یعنی عزیز میاں کو شک ہو جائے گا کہ ضرور یہ کوئی قیمتی چیز ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اس کی قیمت بہت زیادہ مانگے گا۔ اس لیے اس نے عقل کو کام میں لاتے ہوئے دوکاندار سے بات کی لیکن کٹورے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس نے اپنی بات بلّی سے شروع کی۔ انگریز نے کہا ”ارے بھائی درزی

صاحب آپ کی بلّی بہت خوبصورت ہے۔واہ کیا بلّی ہے، مجھے پسند آ گئی ہے۔کیا آپ اسے بیچیں گے؟''

عزیز میاں نے کہا''نہیں بھائی ۔مجھے بلّی سے بہت پیار ہے میں بلّی کے بغیر نہیں رہ سکتا ہر دم اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہوں میں بلّی کو نہ دیکھوں تو لگتا ہے جیسے میری کوئی چیز کھوگئی ہے مجھے بلّی کے بغیر اچھا نہیں لگتا۔''

انگریز نے کہا،'' ٹھیک ہے آپ کو بلّی سے پیار ہے۔اسی لیے تو آپ بلّی پالتے ہیں ۔لیکن مجھے بھی آپ کی بلّی سے پیار ہو گیا ہے ۔کتنی خوبصورت بلّی ہے، کتنی بھولی بھالی ہے۔اب مجھے بھی اس کے بغیر اچھا نہیں لگے گا۔آپ دوسری بلّی پال لیں اور مہربانی کر کے یہ بلّی مجھے دے دیں۔''

عزیز میاں بولے،''نہیں نہیں، میں بلّی نہیں بیچوں گا۔ بھائی بلّی پالنا میرا شوق ہے اس لیے بلّی پالتا ہوں۔ مجھے اپنی بلّی بہت پیاری ہے۔ بھلا اپنی پیاری چیز کوئی بیچتا ہے۔جایئے کوئی اور بلّی خرید لیجیے مجھے معاف کیجیے۔''

انگریز نے کہا،''درزی بھائی میں آپ کو ایک ہزار روپے دوں گا۔ آپ یہ بلّی مجھے دے دیجئے۔''

مگر عزیز میاں اپنی بات پر قائم رہے''نہیں، آپ ایک ہزار کہتے ہیں میں دس ہزار میں نہیں بیچوں گا۔''

انگریز نے بھی پورا زور لگا دیا،''چلیے،دس ہزار میں نہیں بیچتے تو کوئی بات نہیں، میں 12 ہزار دوں گا۔''

عزیز میاں پھر بھی جمے رہے،''میں 20 ہزار میں بھی نہیں دوں گا آپ 12 ہزار کی بات کرتے ہیں...''

اس طرح مول تول ہوتے ہوتے بات پچیس ہزار پر پہنچ گئی۔ ظاہر ہے انگریز کو بلّی نہیں کٹورہ چاہیے تھا اور وہ قیمت بلّی کی نہیں کٹورے کی لگا رہا تھا۔آخر پچیس ہزار پر بات طے ہوگئی انگریز نے پچیس ہزار روپے دیے اور بلّی خرید لی۔

بلّی خریدنے کے بعد انگریز نے کہا،''درزی بھائی بلّی تو آپ نے مجھے دے دی۔اب آپ اس میلے کچیلے گندے پیالے کا کیا کریں گے؟ یہ بھی مجھے دے دیں۔میں اسی میں بلّی کو دودھ پلایا کروں گا۔''

عزیز میاں آنکھیں چمکا کر بولے،''نہیں نہیں اس کٹوری کو میں نہیں دوں گا۔اسی کی وجہ سے تو میں دس بلّیاں بیچ چکا ہوں۔''

انگریز انھیں دیکھتا رہ گیا۔مگر اب وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔اس نے بلی کی بات کی تھی کٹورے کی نہیں۔ □

Mohd Sadr Aalam Gauhar
Village Post Parsolia Via Jai Nagar Distt Madhubani-847226

پرویز اشرفی

گوریّا کی ہنسی

دروازے پر دستک ہوئی۔ تھوڑی دیر میں کامران نے دروازہ کھولا۔ سامنے اُس کے ابّو کھڑے تھے۔ وہ اپنے پیچھے چھپا رکھی چھوٹی سی سائیکل اچانک آگے کرتے ہوئے دروازے میں

داخل ہوئے۔ سائیکل دیکھ کر کامران کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ دوسرے بچوں کو سائیکل چلاتے دیکھ کر اُسے بھی اپنی سائیکل نہ ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ کاش! میری بھی اپنی سائیکل ہوتی تو میں بھی چلاتا۔ لیکن اُس کے ابّو کی آمدنی بہت کم تھی اس لیے اپنے شوق کو دبا دیتا۔ وہ اپنے ساتھی بچوں کی سائیکل چلانے کے لیے اُن کے پیچھے پیچھے رہتا لیکن کوئی اُسے اپنی سائیکل چلانے کو نہیں دیتا۔ ایک دن اسی طرح سائیکل کے پیچھے بھاگتے ہوئے اُس کے ابّو نے دیکھ لیا تھا۔ کامران ساتھیوں سے صرف ایک بار سائیکل چلانے کے لیے گزارش کر رہا تھا لیکن کسی نے سائیکل تو نہ دی بلکہ یہ کہہ دیا کہ ''اپنی سائیکل خرید لو اور چلاؤ۔''

یہ منظر دیکھ کر اُس کے ابّو کو دلی تکلیف ہوئی تھی اور اُنھوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو سائیکل ضرور دیں گے۔

آج اپنے ابّو کے ہاتھ میں نئی چمچماتی سائیکل دیکھ کر خوشی کے مارے چیختا ہوا اندر بھاگا ''امی! میری سائیکل آگئی، میری سائیکل آگئی۔''

نئی سائیکل دیکھ کر سب لوگ بہت خوش ہوئے۔

''کامران! یہ لو تمھارے لیے یہ تحفہ ہے۔ اور بیٹا، ایک ہدایت ہے اگر تمھارا کوئی ساتھی جس کے پاس سائیکل نہیں ہے، تم سے مانگے تو انکار نہ کرنا، اُسے ضرور دینا۔'' ابّو نے سمجھایا۔ والدین بھی اُسے خوش دیکھ کر مسرور تھے۔

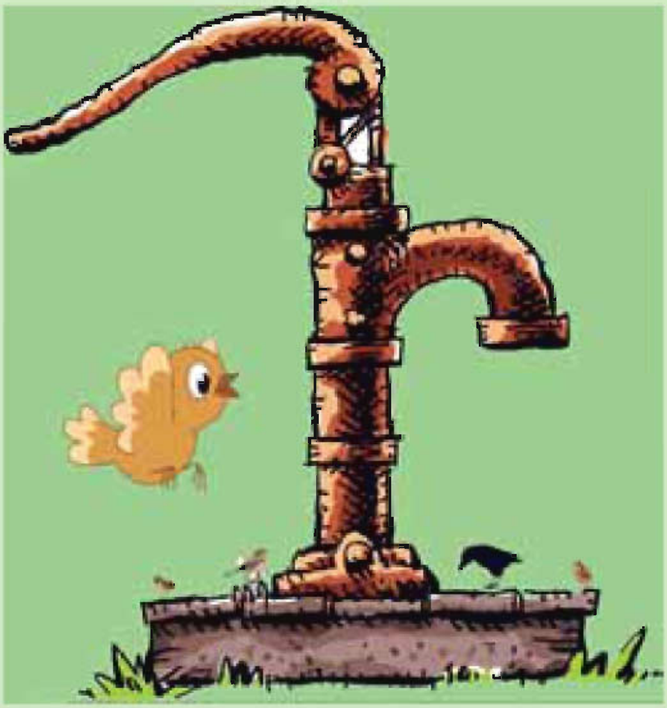

اسکول سے لوٹ کر کامران زیادہ وقت سائیکل چلانے میں گزارتا۔ اُس کے دادا ایک سرکاری کالونی میں رہتے تھے۔ اُن مکانوں کے درمیان ایک سڑک کا ٹکڑا ایسا تھا جہاں کوئی گاڑی نہیں آتی جاتی تھی۔ کالونی میں لگے ہینڈ پمپ کے پاس پانی پھیلا رہتا تھا۔ اکثر چھوٹے چھوٹے پرندے، گوریا، کبوتر، کوّے وغیرہ پانی پینے آجاتے تھے۔ ہینڈ پمپ کے چاروں طرف کچی زمین تھی اور نمی کی وجہ سے کئی قسم کے کیڑے مکوڑے بھی تھے جو اُن پرندوں کی خوراک کے کام آجاتے۔ کامران اور اس کا دوست مون اپنی اپنی سائیکل چلاتے ہوئے جب تھک جاتے تب اُسی ہینڈ پمپ پر پہنچ کر پانی کے چھپکے اپنے چہروں پر مار لیتے تھے۔ ساتھ ہی وہاں پر موجود مختلف پرندوں کو چارہ چگتے ہوئے دیکھ کر اُنھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی کالونی کے دوسرے بچے اُن پرندوں پر پتھر پھینکتے تھے۔ کامران کو یہ حرکت پسند نہ تھی۔ ایسا کرنے پر وہ اُن بچوں کو منع کرتا۔ ''دیکھو! یہ اچھی بات نہیں۔ یہ بھی ہماری طرح جاندار اور اللہ کی مخلوق ہیں۔ اُنھیں کیوں پتھر مارتے ہو؟ جانوروں کے ساتھ ہمدردی کرنا پیارے نبیؐ نے بھی سکھایا ہے۔ اللہ ہمیں اس کا نیک اجر دے گا۔''

ایک دن بچوں نے سائیکل دوڑ کا مقابلہ کیا، کامران بھی جوش میں تھا اور بالآخر اُس نے مقابلہ جیت لیا۔ اُسے انعام ملنے والا تھا، لیکن اُسے خوشی نہیں تھی۔ اس کامیابی سے جہاں سب لوگ خوش تھے وہاں کامران کافی دُکھی تھا۔ بات یہ تھی کہ سائیکل دوڑ کے دوران ایک چھوٹی گوریا اُس کی سائیکل کی زد میں آگئی اور پھڑپھڑانے لگی۔ وہ تیزی سے اُترا گوریا کو دیکھا تو اُس کی چونچ کھلی ہوئی تھی آنکھیں ہلکی ہلکی گردش کر رہی تھیں۔ اُس نے فوراً ہینڈ پمپ کے نزدیک چلّو میں پانی لے کر قطرہ قطرہ گوریا کے چونچ میں ٹپکایا اور پھر اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ گوریا کی گردن کامران کے ہاتھ میں ہی ایک جانب ڈھلک گئی، کچھ بچے اُسے چڑھانے لگے۔ ''ہمیں تو پرندوں پر پتھر مارنے سے روکتے تھے آج خود تم نے ایک پرندے کو مار ڈالا۔''

''میں نے جان بوجھ کر اُسے نہیں مارا۔'' کامران سسکتے ہوئے بولا۔ بچوں کی یہ بات کامران کو رنجیدہ کر رہی تھی۔

کامران کے ماں باپ اُس کی یہ حالت دیکھ کر اُداس ہوگئے، لیکن

یہ محسوس کرکے اچھا لگا کہ کامران کے دل میں دوسرے جانداروں کے لیے رحم ہے۔ کامران کے ابّو نے اُسے بہت سمجھایا لیکن بار بار اُسے اُس گوریّا کی موت پر افسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے رات میں کھانا بھی نہیں کھایا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے گوریّا کا بے جان جسم گھوم رہا تھا۔

کامران کے ابّو نے ایک ترکیب سوچی۔ اُنھوں نے کامران کی پیشانی کو سہلاتے ہوئے کہا ’’ بیٹے کامران! تم بالکل فکر نہ کرو۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں گے تو تم دیکھنا ایک دن وہ گوریّا زندہ ہو کر تمھارے سامنے کھلکھلا کر ہنسنے لگے گی۔‘‘

’’وہ کس طرح ابّو؟‘‘ کامران حیرت سے بولا۔

’’مجھے یقین ہے اللہ معصوم بچوں کی دعائیں جلد قبول کرتا ہے۔‘‘ اُس کے ابّو نے کامران کو یقین دلایا۔ ابّو کی بات اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی۔

اگلے ہی دن کامران کے ابّو اُسے مون اور کالونی کے دوسرے بچوں کو ساتھ لے کر اُس جگہ پہنچ گئے، جہاں ابھی بھی اُس مری ہوئی گوریّا کا مردہ جسم پڑا تھا۔ کامران کے ابّو نے ہینڈ پمپ کے چاروں طرف کی زمین کو کھود کر ایک گڈھا بنایا پھر اُس مری ہوئی گوریّا کو دفن کر دیا۔ پھر اُس پر کھاد وغیرہ ڈال کر ایک خوش رنگ خوشبودار گلاب کا پودا لگا دیا۔ کامران نے اپنے ننھے ہاتھوں سے وہ پودا لگایا۔ آس پاس چند دوسرے پھولوں کے پودے لگائے اور پانی کا چھڑکاؤ کر کے پودوں کی حفاظت کے لیے لوہے کی ایک جالی بھی لگا دی۔ ہینڈ پمپ سے بے کار پانی بہہ کر اُن پودوں کی طرف جانے لگا۔

’’ لیکن ابّو! آپ تو کہہ رہے تھے کہ پرندہ ہنسنے لگے گا؟‘‘ کامران نے بھولے پن سے سوال کیا۔

’’ گھبراؤ نہیں ، اللہ نے چاہا تو کچھ ہی دنوں میں وہ ضرور ہنسے گا‘‘ اُس کے ابّو نے جواب دیا۔

چند ہفتے بعد ایک دن کامران ابّو کی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا اپنے اسکول سے لوٹ رہا تھا تو اُس کی نظر ہینڈ پمپ کے پاس لگے پودے پر خوبصورت سے کھلے ہوئے اکیلے گلاب پر پڑی۔ وہ خوشی کے مارے چیخ اٹھا۔

’’ابو! دیکھیے وہ پرندے والا گلاب کھلا۔‘‘

’’میرے بچے! یہ گلاب نہیں، یہ وہی گوریّا ہنس رہی ہے جو اُس کی جڑوں میں سوگئی تھی۔‘‘ کامران کے ابّو نے سمجھایا۔

کامران کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور ہونٹوں پر گلاب کی پنکھڑیوں جیسی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے اُس کے دل کو سکون مل گیا ہو!! ◻

PARWEZ ALAM
D-321, Dawat Nagar Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025

انگریزی سے ترجمہ : مسعود منور

جنگلی چوہا اور اُونٹ

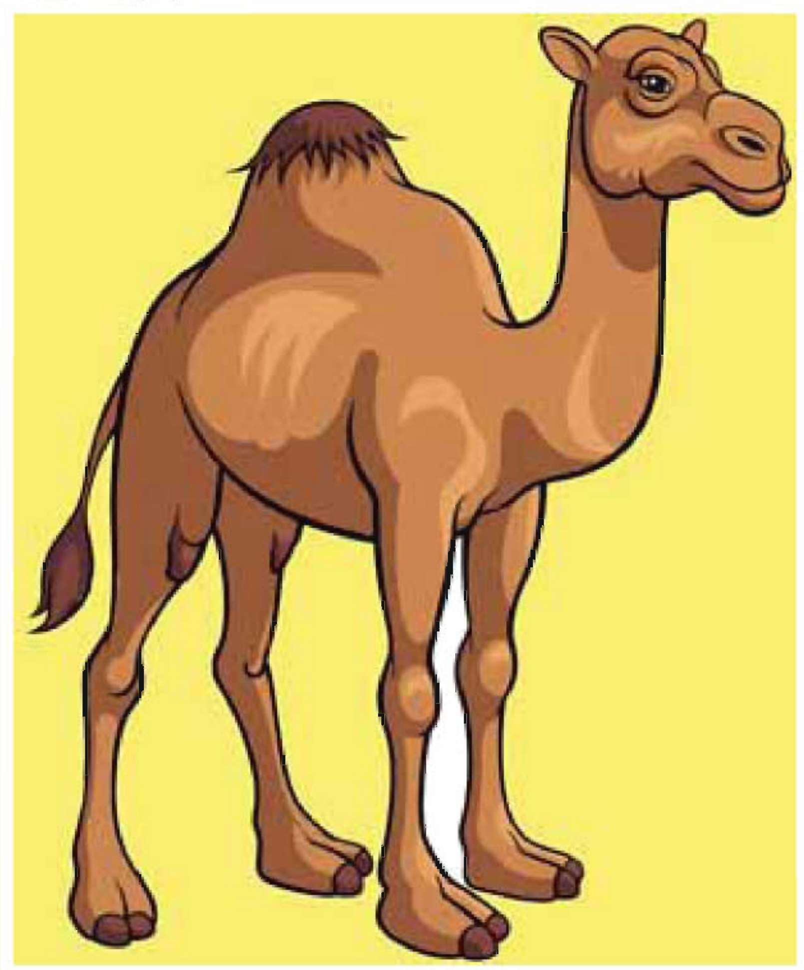

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک جنگلی چوہے کو جنگل میں ایک جانور نظر آیا۔ جس کی لمبی گردن، اونچا قد، اونچی لمبی ٹانگیں اور کمر پر ایک بہت بڑا کوہان تھا۔

''تم کون ہو؟'' جنگلی چوہے نے جانور سے پوچھا۔

''میں، اونٹ ہوں۔'' جانور نے جواب دیا۔ میں ایک پرانے قبیلے سے ہوں اور میں راجستھان کے صحرا کا رہنے والا ہوں تم بہت کم معلومات رکھتے ہو، اتنی کم کہ مجھے بھی نہیں جانتے!''

'' معاف کرنا بھئی...'' جنگلی چوہے نے کہا۔ ''میں اکثر و بیشتر اپنے بل میں ہی رہتا ہوں۔ کیونکہ آدمی، جو میرے قبیلے کا دشمن ہے، مجھے دیکھ لے تو جان سے مار دیتا ہے۔ تم اگرچہ کچھ عجیب سے لگتے ہو لیکن، اس کے باوجود میں تمھیں پسند کرتا ہوں، کیا تم میرے دوست بنو گے؟''

''دھت!'' اونٹ نے اپنا نچلا ہونٹ موڑا اور چوہے کے بل کے پاس اُگی ہوئی جھڑبیری کے پتے کھانے لگا۔

''میں کئی طرح سے تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔'' چوہے نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تم میری مدد کر سکتے ہو؟'' اونٹ بولا۔ ''میں تم سے بہت بڑا

ہوں اور تم تو بس پدّے سے ہو!''

''میں جانتا ہوں کہ میں چھوٹا ہوں اور تم بڑے ہو۔'' چوہے نے کہا۔ ''لیکن تم دیکھو گے کہ میں کسی نہ کسی طرح تمھارے کام ضرور آؤں گا۔''

''دھت!'' اُونٹ بلبلایا اور مزید ہرے ہرے پتوں تک منہ مارنے کی کوشش میں اپنی لمبی گردن کو اور بھی بلند کرتا گیا۔ عین اُس وقت اُسی کی نکیل کی رسی اسی درخت کی ٹہنیوں میں پھنس گئی جس کے وہ پتے چر رہا تھا۔

چوہے نے سرگوشی کی ''دیکھا تم نے! اب تمھیں میری مدد کی ضرورت پڑ رہی ہے۔''

اُونٹ کو غصہ آگیا۔ اُس نے گردن کو جھٹکا دیا اور رسی چھڑانے کی کوشش کی کی لیکن وہ شاخوں کے درمیان اور بھی الجھتی گئی۔

چوہا درخت پر جا چڑھا اور اُس نے رسی کو دانتوں سے کُتر دیا۔ اونٹ آزاد ہوگیا۔ اور پھر سے ہرے پتّے چرنے لگا۔

''دیکھا تم نے!، اب تم پیٹ بھر کر کھا سکتے ہو۔ اور یاد رکھو، میں تمھارا اچھا دوست ثابت ہوں گا۔'' چوہے نے کہا۔

اُونٹ اتنا قدر آور اور مغرور تھا کہ اُس نے چوہے کی بات تک نہ سُنی اور قرب کی جھاڑیوں میں چرنے کے لیے آگے نکل گیا۔

کچھ عرصہ بعد ایک بادشاہ اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ جنگل میں آگیا۔ جب اُس نے اُونٹ کو دیکھا تو اپنے فوجیوں سے کہا کہ وہ اُسے پکڑ لیں۔

''تم لوگ مجھے میرے مالک چوہے کی اجازت کے بغیر نہیں پکڑ سکتے۔'' اونٹ نے کہا۔

''یہ جسے تم اپنا مالک کہہ رہے ہو، وہ کون چوہا ہے؟ بھلا ایک چوہا کسی اونٹ کا مالک کیسے ہوسکتا ہے؟ تمھارا مالک میں ہوں! میں اس ملک کا بادشاہ ہوں اور تم سب کی حفاظت کے لیے دشمن سے لڑتا

ہوں۔" بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اونٹ کو پکڑ لیں۔ اُسے رسے سے باندھ کر رکھیں۔ اُس پر سامان لادیں اور اسے اپنے ساتھ راستے پر لے چلیں۔

چوہے نے جو یہ سب سُنا تو اپنا منہ ذرا سا بل سے باہر کو نکالا اور کہا" بادشاہ سلامت، یہ اُونٹ میرا ہے، مہربانی کر کے اِسے ساتھ مت لے جائیں۔"

بادشاہ خیمہ گاہ کی طرف گھوڑا بڑھاتا گیا جہاں سپاہیوں نے اُس کا شاہی خیمہ لگا رکھا تھا۔

چوہے کو بڑا غصہ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اونٹ کو غلام بنالیا جائے گا۔اُس نے سیٹی بجا کر جنگل کے سارے چوہوں کو بُلا لیا ۔ یہ خطرے کی سیٹی کا اشارہ تھا جسے سن کر سیکڑوں چوہے اپنے اپنے بلوں سے باہر نکل پڑے اور اُس کے پاس پہنچ گئے۔

چوہے نے اُن سے کہا، "لمبی گردن والے میرے عجیب الخلقت دوست اونٹ کو ظالم بادشاہ پکڑ کر لے گیا ہے۔ اُونٹ تھوڑا سا بیوقوف ہے اور اپنی حفاظت کرنے میں زیادہ ہوشیار نہیں۔ لوگ اُسے استعمال کرتے ہیں اور اُسے کھانے کے لیے صرف کانٹے دیتے ہیں۔ ہمیں اُس کو بچانا ہے۔"

سبھی چوہے اس بات سے متفق تھے کہ اُنھیں اپنے چچیرے بھائی کے دوست کو بچانا ضروری ہے۔

"ہمارے پاس ایک ہتھیار ہے جو بادشاہ کے پاس نہیں ہے۔" اُونٹ کے دوست چوہے نے کہا۔ "ہم اپنے تیز دانتوں سے اس کا سب کچھ کتر ڈالتے ہیں۔میرے ساتھ آؤ اور بادشاہ کے تمام گھوڑوں، ہاتھیوں، ٹٹوؤں اور گدھوں اور دوسرے جانوروں کی رسیاں کُتر ڈالو! ہم ان ظالم انسانوں سے تمام جانوروں کو آزاد کرائیں گے ۔ آؤ بادشاہ کی خیمہ گاہ تک چلیں اور رات ہی رات میں جب کہ سپاہی سو رہے ہوں گے، یہ کام تمام کر ڈالیں۔" تمام چوہوں نے سیٹیاں بجا کر اپنی رضا مندی ظاہر کردی۔ اور جیسا کہ اُن کے لیڈر نے کہا تھا، انہوں نے بادشاہ کے تمام گھوڑوں، ہاتھیوں، ٹٹوؤں، گدھوں اور دوسرے جانوروں کی رسیاں کُتر ڈالیں۔ بادشاہ کے دشمنوں کو معلوم ہو گیا کہ چوہوں نے کیا کر دیا ہے۔ صبح کے وقت وہ آئے اور اُس ظالم بادشاہ پر حملہ کردیا جس نے چوہے کے دوست اُونٹ کو قید کیا تھا اور اُسے شکست دے دی۔

گھوڑے، ہاتھی، ٹٹو، گدھے اور دوسرے سارے جانور تو بھاگ کر جنگل میں جا گھسے۔

لیکن اُونٹ جو پہلے چوہے کی بات بھی سننے کو تیار نہیں تھا اُس کی طرف بڑھا اور بولا، "تمام بڑے ہمیشہ ایک سے بڑے نہیں رہتے، اور تمام چھوٹے اتنے چھوٹے نہیں کہ اُن کی بات بھی نہ سنی جائے، آؤ ہم ہمیشہ کے لیے دوست بن جائیں۔ تم میری کمر پر کجاوے میں رہو گے اور جب میں مشکل میں پڑوں تو میری مدد کیا کرو گے اور ہم دونوں ملکوں ملکوں گھومیں گے اور سیر کریں گے۔"

اس کے بعد دونوں دوست ہنسی خوشی ساتھ رہنے لگے۔

Masood Munawwar
Oslo-omrádet, Noway

ترجمہ و تلخیص: نصر ملک

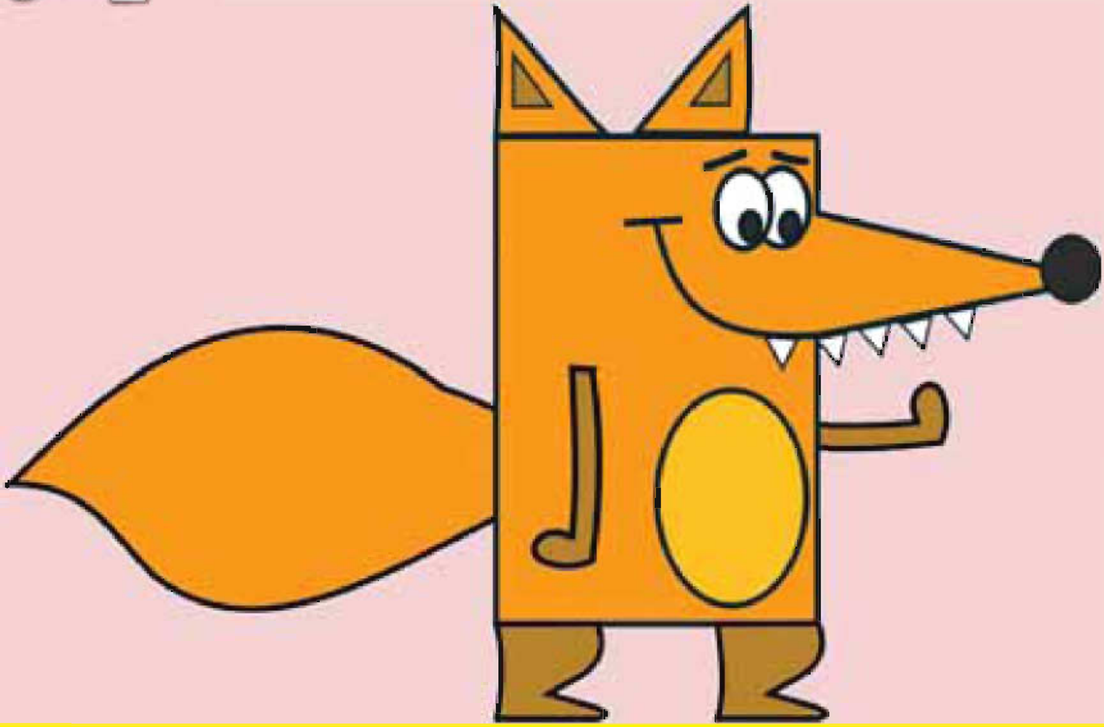

بادشاہ کا ایلچی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لومڑی کسی کسان کی مُرغی چُرا کر اپنی کُھوہ میں لے گئی۔ لومڑی نے پہلے دن تو مرغی کے بازو کھائے پھر دوسرے روز اُس کا سینہ اور تیسرے دن مرغی کی ٹانگیں بڑے مزے لے کر کھا گئی۔ یوں لومڑی کو کم سے کم تین دن شکار کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی اور ایک ہی مرغی سے اُس کے یہ دن اچھی طرح گزر گئے۔

اب مرغی تو ختم ہو چکی تھی اور لومڑی کو مزید خوراک کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ خوراک کی تلاش میں اپنی کھوہ سے نکلی اور قریب کے گاؤں کی طرف چل دی۔ رستے میں اُسے پگڈنڈی پر پڑی ایک ٹوپی ملی۔ اُس نے ٹوپی کو اٹھا کر جھاڑا اور پھر سر پر پہن لی۔ اب وہ چلتے چلتے ایک کسان کے گھر پر پہنچ گئی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' اندر سے کسان کی آواز آئی۔

''میں بادشاہ کا ایلچی ہوں۔'' لومڑی نے جھوٹ بولا۔

کسان نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

''اندر تشریف آئیں۔'' اُس نے کہا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''پہلے تو میری یہ ٹوپی کہیں سنبھال کر رکھو اور پھر میرے لیے کھانے اور رات بسر کرنے کے لیے بستر کا بندوبست کرو۔'' لومڑی نے کہا۔

"جی، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" کسان نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

کسان نے لومڑی کو کھانا کھلایا اور اُس کے سونے کے لیے ایک آرام دہ بستر لگا دیا۔

کوئی آدھی رات کے وقت لُومڑی اٹھی اور دبے پاؤں، اپنی ٹوپی تلاش کی اور بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر نکل گئی اور وہاں ایک جگہ اپنی ٹوپی چھپادی اور پھر واپس آ کر سوگئی۔

اگلی صبح کسان نے ناشتہ تیار کر کے لومڑی کے سامنے رکھا اور جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکی تو اس نے کسان سے کہا کہ اب وہ اُس کی ٹوپی لے آئے کیونکہ اُسے سفر پر آگے جانا ہے۔

کسان نے ٹوپی کی تلاش میں سارا گھر چھان مارا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اُس نے ٹوپی کہاں رکھی تھی، لیکن ٹوپی وہاں ہوتی تو ملتی۔ وہ تو غائب ہو چکی تھی۔ وہ سخت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ آخر وہ لومڑی کے پاس آیا اور اُسے ٹوپی کی گمشدگی کے بارے میں بتایا اور گڑگڑا کر درخواست کی یہ خبر بادشاہ تک نہ پہنچے۔

"ٹھیک ہے، اگر تم مجھے ٹوپی کے بدلے میں اپنی ایک مرغی دے دو تو میں بادشاہ سلامت سے شکایت نہیں کروں گا۔" لومڑی نے کہا۔

کسان نے اپنی ایک مرغی اُس کے حوالے کر دی۔ لومڑی نے مرغی بغل میں دبائی، کسان کو خدا حافظ کہا اور کہیں آگے روانہ ہوگئی۔ چلتے چلتے، شام کے وقت وہ ایک اور کسان کے گھر پر جا پہنچی۔ اور اُس کے دروازے پر دستک دی۔

"بھئی کون ہے اس وقت؟" کسان نے اندر سے پوچھا۔

"میں، بادشاہ کا ایلچی۔" لومڑی نے کچھ رعب دار آواز میں جواب دیا۔

"آیئے، آیئے، تشریف لایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" کسان نے جلدی سے دروازہ کھول کر پوچھا۔

"تم اس مرغی کا خیال رکھو اور میرے لیے کھانے کا اور رات گزارنے کے لیے بستر کا بندوبست کرو۔" لومڑی نے کہا۔

"جی، جیسی آپ کی مرضی۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" کسان نے کہا۔

کسان نے لومڑی کو کھانا کھلانے کے بعد اُس کے لیے بستر لگا دیا اور مرغی کو ایک ٹوکری میں بٹھا کر اُس کے اوپر ایک موٹا کپڑا ڈال دیا۔ آدھی رات کے وقت لومڑی چپکے سے اٹھی اور مرغی کو ہڑپ کر گئی اور پھر بستر پر جا کر سوگئی۔

اگلی صبح کسان نے لومڑی کو ناشتہ پیش کیا تو اُس نے تھوڑا سا کھانے کے بعد کسان سے کہا کہ وہ اُس کی مرغی لے آئے کیونکہ ابھی اُسے بہت لمبا سفر کرنا اور آگے جانا ہے۔

کسان نے مرغی کو تلاش کیا مگر وہ کہیں ہوتی تو ملتی۔ اُس نے واپس آ کر لومڑی کو بتایا کہ مرغی نہیں ملی، معلوم نہیں کہاں غائب ہوگئی ہے۔ لومڑی کے تیور دیکھ کر کسان نے درخواست کی کہ وہ یہ بات بادشاہ سلامت کو نہ بتائے۔

"چلو ٹھیک ہے، لیکن اس کے بدلے میں تمھیں بھیڑ کا ایک بچہ دینا پڑے گا۔" لومڑی نے کہا۔

کسان نے ایسا ہی کیا اور لومڑی بھیڑ کے بچے کو گردن پر اُٹھا کر وہاں سے آگے چل دی۔

شام گئے وہ پھر ایک کسان کے گھر جا پہنچی اور دروازے پر دستک دی۔ کسان نے جوں ہی سُنا کہ باہر بادشاہ سلامت کا ایلچی کھڑا ہے تو اُس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

"آپ کی آمد کا شکریہ، بندے کے لیے کیا حکم ہے؟" کسان نے پوچھا۔

''تم بھیڑ کے بچے کا خیال رکھو۔ مجھے یہ بادشاہ سلامت کو پیش کرنا ہے۔ مجھے رات کا کھانا اور سونے کے لیے بستر چاہیے، ان کا بندوبست کرو۔'' لومڑی نے کہا۔

''جی، ابھی لیجیے، آپ تشریف رکھیں!'' کسان نے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد لومڑی بستر پر جا لیٹی۔ مگر آدھی رات کے وقت اُس نے اٹھ کر بھیڑ کے بچے کو کھا لیا اور پھر بستر پر لیٹ کر سو گئی۔

اگلی صبح کسان نے لومڑی کو ناشتہ پیش کیا تو اس نے کہا کہ اسے اس کی طلب نہیں۔ اُس نے کسان سے کہا کہ بھیڑ کے بچے کو فوراً لے آئے کیوں کہ اس نے ابھی اور آگے جانا ہے۔

کسان نے بھیڑ کے بچے کو تلاش کیا لیکن جہاں اُس نے بھیڑ کے بچے کو باندھا تھا وہاں چند ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کسان سمجھ گیا کہ لومڑی بھیڑ کے بچے کو کھا چکی ہے۔ لیکن وہ کچھ ظاہر کیے بغیر بولا، ''مجھے بھیڑ کا بچہ نہیں مل رہا، معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ اس بارے میں بادشاہ سلامت کو کچھ بھی نہ بتائیں۔''

''اگر تم مجھے اس کے بدلے میں اپنی ایک بھیڑ دے دو تو میں بادشاہ سے اس کی شکایت بالکل نہیں کروں گی۔'' لومڑی نے بڑی مکاری سے کہا۔

کسان نے باہر جا کر اپنا بڑا رکھوالا کُتا پکڑا، اسے ایک بوری میں ڈالا اور بوری کا منہ بڑی مضبوطی سے باندھ کر بوری لومڑی کے سپرد کر دی۔ ''لیجیے، یہ ایک بڑی اعلیٰ نسل کی بھیڑ ہے۔ میں نے اسے اس لیے بوری میں ڈال دیا ہے کہ آپ کو اسے اُٹھانے میں آسانی رہے۔''

لومڑی اب کہیں اور جانے کی بجائے، خوشی خوشی سیدھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

''میرا پیٹ تو اب اتنا بھرا ہوا ہے کہ اگلے ایک دو دن اور کچھ کھانے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔'' گھر پہنچ کر وہ اپنے آپ سے بولی۔ ''میں اس بھیڑ کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتی ہوں۔ طلب ہوگی تو کھا لوں گی۔''

بھیڑ کو باہر نکالنے کے لیے جب اُس نے بوری کا منہ کھولا تو اندر سے ایک بہت بڑا کتا اچھل کر باہر نکل آیا۔ اور لومڑی بڑی تیزی سے لپک کر اپنی کھوہ میں جا گھسی۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی مگر کُتا ابھی تک کھوہ کے منہ کے قریب کھڑا اُسے سونگھ رہا تھا۔

کھوہ کے اندر پہنچ کر ہانپتے ہوئے لومڑی سوچنے لگی کہ اسے اس مصیبت میں کِس نے پھنسایا ہے۔

''یہ میری آنکھیں ہوں گی۔'' وہ اپنے آپ سے باتیں کر

رہی تھی۔

''نہیں، ہم نے ایسا نہیں کیا۔'' آنکھیں بول پڑیں۔ ''ہم نے تو کھوہ کا رستہ دیکھنے میں تمھاری مدد کی ہے۔''

''پھر یہ میری ناک ہوگی، جس نے ایسا کیا ہے۔'' لومڑی بڑ بڑائی۔

''نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' ناک نے چلا کر کہا۔ ''میں تو خوارک تلاش کرنے میں ہمیشہ تمھاری مدد کرتی ہوں لیکن اس بار بوری کا منہ بندھا ہوا تھا اور میں سونگھ نہیں سکی تھی۔''

''اچھا تو پھر یہ میری ٹانگیں ہوں گی، جنھوں نے بے وفائی کی ہے۔'' لومڑی اب غصے میں تھی۔

''نہیں، نہیں! ہم نے ایسا نہیں کیا۔'' ٹانگیں بولیں۔ ''ہم نے تو بچاؤ کے لیے بڑی تیزی سے کھوہ کے اندر چھلانگ لگائی تھی۔''

''ہاں! میں اب سمجھ گئی ہوں کہ اصل قصوروار کون ہے، یہ کمبخت میری دُم ہے۔'' لومڑی نے کہا۔

''نہیں، میں ایسا کیوں کروں گی۔'' دُم بولی۔ ''میں تو ہمیشہ تمھارے پیچھے پیچھے تمھارے اشاروں پر ہلتی ہوں۔''

''تم نے کبھی میری کوئی مدد نہیں کی۔ اب تم نہیں بچ سکو گی۔ تمھیں تمھارے کیے کی سزا ملے گی۔'' لومڑی بڑے غصے سے بولی۔ اور پھر اُس نے اپنی دُم کھوہ سے باہر نکال دی تا کہ کُتا اُسے نوچ سکے۔ کتے نے دُم کو دانتوں میں دبا کر اس زور سے کاٹا کہ دم کا ایک حصہ اُس نے منہ میں آ گیا۔ کتا لومڑی کی کٹی ہوئی دم منہ میں دبائے، بھاگتا ہوا اپنے مالک کے پاس جا پہنچا۔

''شاباش، میرے وفادار کتّے، یہ ہوئی نا بات!'' کسان نے مسکراتے ہوئے، کتے کی کمر کو تھپتھپایا۔ ''اگلی مرتبہ جب ہم شکار پر جائیں گے تو ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہوگا کہ ہمیں کس لومڑی کا شکار کرنا ہے۔''

کسان اپنی جگہ مطمئن تھا لیکن، ادھر لومڑی بھی تدبیریں سوچ رہی تھی۔ عیاری و مکاری میں اس کا کوئی ثانی تو تھا نہیں۔ وہ جنگل کی دوسری لومڑیوں کے پاس گئی اور اُن سب کو اکٹھا کر کے بولی کہ اسے ایک بڑی اہم خبر ملی ہے اور وہ یہ کہ علاقے میں ایک نیا تھانیدار آیا ہے۔ وہ لمبی دم والی لومڑیوں کی تلاش میں ہے اور انہیں زیادہ سے زیادہ شکار کرنا چاہتا ہے۔ اگر تمھیں اپنی اپنی زندگی پیاری ہے تو تم سب بھی یہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ دیکھو میں نے اپنی آدھی دم کاٹ دی ہے۔ اگر تم سب اپنی خیر چاہتی ہو تو تم بھی ایسا ہی کرو۔ پھر سب لومڑیوں نے اُس کے کہنے پر عمل کیا۔

کچھ عرصے بعد دیہاتی کسان لومڑیوں کے شکار کو نکلے۔ اور یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ جنگل کی تمام لومڑیاں دم کٹی تھیں۔ وہ چوپال میں آج بھی، اس بارے میں ایک دوسرے سے بڑی حیرانی کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ ساری لومڑیاں دُم کٹی کیوں تھیں!

Nasr Malik Copenhagen, Denmark

□ مترجم: انیس الدین ملک/نظر ثانی: نصرت ظہیر

سائنس کی الف لیلہ

پھٹکری کی حیرت انگیز کہانی!

پھٹکری Alum کا علم تقریباً پچھلے پانچ سو سال سے ہے۔ اسے ایک خاص قسم کے پتھر سے حاصل کرتے ہیں جسے پھٹکری کہتے ہیں۔ یہ پتھر دنیا کے کچھ علاقوں میں زمین میں بہت کم گہرائی پر پائے جاتے ہیں۔ پھٹکری ایک نہایت آسان طریقے سے بنائی جاتی ہے۔ پھر بھی پھٹکری کی کھان سے بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں کیونکہ یہ زمین کی سطح کے قریب ہی پائے جاتے ہیں۔ پھٹکری کے بہت سارے استعمال ہیں لیکن اس کا خاص استعمال رنگنے کے عمل میں ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ قدرتی طور پر پائے جانے والے پھیکے رنگوں میں چمک پیدا کرتا ہے۔ یہ پرانے وقتوں کے رنگوں کو پکّا کرنے میں بھی کام آتا ہے تاکہ رنگ کپڑے کی دھلائی کے بعد اتر نہ جائیں۔ اس کے علاوہ پھٹکری کاسمیٹکس بنانے اور اور کئی طرح کی دواؤں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

پھٹکری کی ایک خوبی یہ ہے کہ اسے لگانے سے نہ صرف معمولی زخم سے بہتا ہوا خون رک جاتا ہے بلکہ یہ ایک اینٹی سپٹک کا کام بھی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ہیئر کٹنگ سیلونوں بار بر شیونگ کے سامان کے ساتھ پھٹکری ضرور رکھتے ہیں۔آفٹر شیولوشن میں بھی پھٹکری ڈالی جاتی ہے۔اس کے علاوہ نئے زمانے میں یہ پانی صاف کرنے کے کارخانوں میں کام آتی ہے اوراس سے جراثیم ختم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

کیمیکل انالسز Chemical Analysis کے مطابق پھٹکری دراصل ہائڈروجن، پوٹاشیم المونیم اور گندھک کا کمپاؤنڈ ہے اور اسے hydrated potassium aluminium sulfate کہتے ہیں۔المونیم کے Alum سے اس کا مختصر نام بھی نکلا ہے۔ پندرہویں صدی میں پھٹکری ایک بیش قیمت شے تھی۔ یورپ میں استعمال کی جانے والی اس کی بیشتر مقدار پڑوسی ملک ترکی کے شہر قسطنطنیہ سے آتی تھی جہاں اس کی بہت سی کھانیں تھیں۔ جب 1453 میں ترکوں نے اس شہر پر فتح حاصل کی تو انھوں نے فوراً ان کھانوں پر قبضہ کرلیااوراس طرح دنیا میں پھٹکری بنانے کے کارخانوں کے سب سے بڑے مالک بن گئے۔

شہر کے فتح ہونے سے پہلے ایک اطالوی جس کا نام جیوانی ڈا کاسٹرو Giovanni da Castro تھا، قسطنطنیہ میں رہتا تھا۔ وہ کپڑے اور رنگوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اپنے اس کام کے دوران اسے پھٹکری کے بارے میں کافی واقفیت ہوگئی تھی۔ 1453 میں وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے وطن آنے میں کامیاب ہوگیا۔کئی سال کے بعد ایک دن جب وہ ٹولفا کے قریب پہاڑیوں میں گھوم رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ وہاں جو گھاس اگی ہوئی تھی اس کا وہی رنگ ہے جو قسطنطنیہ میں پھٹکری کی کھانوں کے قریب کی گھاسوں کا رنگ تھا۔ اس نے وہاں سے کچھ پتھر اٹھائے اور انھیں توڑ کر اس کا مزا چکھا۔اس کا نمکین ذائقہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا پھٹکری کی کھانوں کے قریب پتھروں کا ہوتا ہے۔چند اور تجربوں کے بعد اس کو یہ یقین ہوگیا کہ اس نے پھٹکری کے پتھروں کا ایک بیش قیمت زخیرہ دریافت کرلیا۔وہ پوپ پائس دوم Pius-ii کو اس حیرت انگیز دریافت کے بارے میں بتانے کے لیے ٹولفا سے روانہ ہوا۔ اپنی دریافت کو اس نے ان لفظوں میں بیان کیا۔

پوپ پائس دوم

''میں آپ کو ترکوں پر فتح کی خوش خبری دیتا ہوں۔وہ عیسائیوں سے پھٹکری کے عوض تین لاکھ اشرفیاں لیتے ہیں۔ میں نے سات ایسی پہاڑیاں دریافت کرلی ہیں جن میں پھٹکری اتنی کثیر مقدار میں ہے کہ وہ سات دنیاؤں کے لیے بھی کافی ہوگی۔ اگر آپ وہاں کاریگر بھیج دیں اور بھٹیاں بنوادیں تو آپ پورے یورپ کو پھٹکری مہیا کرا سکتے ہیں۔ وہاں لکڑی اور پانی کی بہتات ہے اور آپ کی وہاں ایک بندرگاہ بھی ہے جہاں مغرب میں جانے والے جہازوں کو سامانوں سے لادا بھی جاسکتا ہے۔ اب آپ ترک کے خلاف جنگ لڑسکتے ہیں۔ یہ معدنیات آپ کے لیے روپے کی شکل میں جنگ کا وسیلہ فراہم کریں گی اور دوسری طرف ترکوں کو پیسوں سے محروم کردیں گی۔''

پوپ کے زمانے کے پھٹکری کارخانے

پوپ کے خیال میں کاسترو کے یہ الفاظ ایک پاگل آدمی کی بکواس تھے اور تمام کارڈنیل بھی یہی رائے رکھتے تھے۔ اگرچہ کاسترو کی یہ تجویز رد کردی گئی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری، اور آخرکار پوپ کو اس بات کے لیے راضی کرلیا کہ کاریگروں کی وہ جماعت جو قسطنطنیہ کی کھانوں میں کام کرچکی تھی، وہاں جاکر اس بارے میں تحقیقات کرے۔ اس جگہ کا بہت قریب سے معائنہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے اعلان کیا کہ یہ زمین ایشیائی پھٹکری مہیا کرنے والی پہاڑیوں سے کافی مشابہ ہے۔ خوشی کے مارے ان لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ انھوں نے خدا کی تعریف اور اس مہربانی کے شکرانہ کے طور پر کہ اس نے انھیں اس بیش قیمت تحفے سے نوازا، تین بار سجدہ کیا۔ پتھروں کو نکالا گیا اور ان سے جو پھٹکری دستیاب ہوئی وہ ایشیائی پھٹکری سے زیادہ خوشنما اور اعلیٰ درجہ کی تھی۔

پوپ نے پھٹکری کے کارخانے بنوانے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ پتھروں کو پہلے بھٹی میں پکایا گیا اور پھر اس کو پانی میں ڈال دیا گیا۔ پتھر میں موجود پھٹکری پانی میں گھل گئی اور بقیہ گندے مادے، برتن کے پیندے میں بیٹھ گئے۔ محلول کو پھر ایک بڑے سیسے کے برتن میں ڈال دیا گیا۔ جہاں اس کو اس وقت تک گرم کیا گیا جب تک یہ روے دار نہ ہوجائیں۔ آخیر میں اسے لکڑی کے ایک برتن میں ڈال دیا گیا۔ اس میں اسے اس وقت تک ساکت چھوڑ دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر ایک اعلیٰ درجے کی پھٹکری حاصل ہوئی۔ ہمیں یہ بتلایا گیا کہ پوپ پائس دوم کو کافی منافع ہوا اس لیے اس نے آٹھ سو سے زیادہ آدمیوں کو ٹولفا میں اسے تیار کرنے کے لیے لگایا۔

تھوڑے ہی عرصے میں اگلا پوپ، جو کہ جولیس دوئم تھا، پھٹکری کے کارخانوں سے سالانہ ایک بھاری رقم کما رہا تھا۔ اس نے اس آمدنی اور اپنے آپ کو ترکوں کے خلاف جنگ کے لیے وقف کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے تحت پوپ کے علاوہ کوئی اور پھٹکری نہیں بنا سکتا تھا۔ پوپ نے یہ بھی واضح کردیا کہ اس کے علاوہ کوئی اور پھٹکری بنائے گا تو یہ جرم ہوگا اور اس سے کلیسائی حق چھین لیا جائے گا۔ پوپ نے ترکوں سے پھٹکری خریدنا بھی جرم قرار دے دیا۔ اس جرم کی سزا بھی کلیسائی حق سے محرومی تھی اور اس سزا سے عیسائیوں کا کیتھولک فرقہ بہت ڈرتا تھا۔

لیکن پروٹسٹنٹ عیسائی نہ تو پوپ کے قہر کی پروا کرتے تھے نہ اس

سرتھامس چالونر

کے کلیسائی حق سے محرومی کی سزا کا۔ ایک رومانی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ایک انگریز پروٹسٹنٹ نے پوپ کے حکم کی نافرمانی کی اور اپنے ملک میں پھٹکری بنانے کا کام شروع کیا۔ کہانی کا آغاز کیسٹرو کی ٹولفا کی پہاڑیوں سے پھٹکری کی دریافت کی کہانی سے ملتا جلتا ہے۔

یہ مشہور انگریز مناظر قدرت کا عالمِ سر تھامس چالونر Sir Thomas Chaloner تھا۔

''یہ مشاہدہ کیا گیا کہ گیسبر و Gisborough (جو یارک شائر میں ہے) کے قریب اگے ہوئے درختوں کی پتیوں کا ہرا رنگ ایک خاص قسم کا تھا۔ شاہ بلوط کی جڑیں کافی موٹی تھیں لیکن زمین میں کافی گہرائی تک نہیں جاتی تھیں۔ وہ کافی مضبوط ہوتی تھیں لیکن ان میں چھال بہت کم تھی۔ زمین کی مٹی سفید تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پیلا اور نیلا رنگ چھڑک دیا گیا ہو اور یہ مٹی صاف اور خوبصورت راتوں میں شیشے کے مانند چمکتی تھی۔''

سر تھامس نے ایسا منظر اٹلی کے پھٹکری پیدا کرنے والے ضلع میں دیکھا تھا۔ اسے یہ گمان ہوا کہ شاید اس نے گیسبر و میں پھٹکری کی کان دریافت کرلی ہے۔ اس نے جانچ کے کئی تجربات کیے اور یہ جان کر بے انتہا خوش ہوا کہ وہاں کثیر مقدار میں پھٹکری کے پتھر موجود ہیں۔ اس نے گیسبر و میں ایک پھٹکری کا کارخانہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن اس کے لیے مشکل مرحلہ ان طریقوں کو معلوم کرنا تھا جس طریقے سے پوپ اس شے کو بنواتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ پوپ کے کارخانے کو اجنبیوں سے محفوظ رکھا جاتا تھا بلکہ اگر کوئی شخص ان خفیہ طریقوں کو جاننے کی کوشش کرتا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ سر تھامس پکڑے جانے کے خدشات کے باوجود اٹلی گیا اور وہاں پھٹکری کی کانوں میں کام کرنے والے دو یا تین آدمیوں کو رشوت دے کر اس بات کے لیے راضی کرلیا کہ وہ اس کے ساتھ انگلینڈ چلیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے ان آدمیوں کو بڑے پیپوں میں بند کردیا اور ان پر لکھا تھا 'انگلینڈ کے لیے'۔ بندرگاہ کے آفیسروں کو اس کا وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ اس میں غیر معمولی چیز چھپی ہے، اور انھوں

انگلینڈ کا بادشاہ چارلس اول

نے اس کو برٹش جہاز پر رکھنے کی اجازت دے دی جو جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

گیسبر و میں آنے کے بعد اطالیوں نے ایک پھٹکری کا کارخانہ قائم کیا اور یہ نیا فن مقامی لوگوں کو سکھایا۔ پوپ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے لڑاکو اور بھگوڑے اطالیوں کو بہت برے الفاظ میں کوسا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کہ راہب ارنلفنس نے کئی صدی قبل کیا تھا۔ اس میں سر سے لے کر پیر تک جسم کے ہر حصے کو بہت بڑے اور غضبناک الفاظ میں کوسا گیا تھا۔

چالونر اس سے بالکل پریشان نہیں ہوا بلکہ اس کی تجارت میں اور زیادہ ترقی ہوئی اور خاص طور پر اس وقت جب بادشاہ نے ملک میں پھٹکری بنانے کا حق صرف چالونرس کو دیا۔ یہ سلسلہ نہایت خوش اسلوبی سے اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ دوسرے بادشاہ چارلس اول نے جسے رقم کی ضرورت تھی ان قیمتی پھٹکری کی کانوں کو اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ نہیں کرلیا۔ اس فیصلے کے بعد اس نے یہ قبضہ ایک معمولی اعلان کے ذریعہ کیا۔ جس کے مطابق کانیں شاہی ملکیت ہیں اور ان

انگلینڈ کے بادشاہ چارلس اول کی سزائے موت کا منظر جس کے لیے حکم نامے پر دستخط کرنے والوں سر تھامس چالونز بھی تھا
کیونکہ چارلس نے اس کا پھٹکری کارخانہ چھین لیا تھا... یہ پینٹنگ اسکاٹ لینڈ میں ملی لیکن مصور کے نام کا پتہ نہیں چل سکا

کانوں کا تمام منافع شاہی خزانے میں جانا چاہیے۔

فطرتاً چالونرس آمدنی کے اس بیش بہا ذریعہ کے کھو جانے سے بہت ناراض ہوا۔لیکن وہ بے بس تھے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ 1614 میں جب پارلیامنٹ نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کردی تو ایک تلخ لڑائی چھڑ گئی اور اسے بدلہ لینے کا ایک موقع مل گیا اور اس نے پارلیامنٹ کا ساتھ دیا۔

اور جیسا کہ سب اچھی جانتے ہیں چارلس کو شکست ہوئی اور 1649 میں اس پر ایک غدار، ظالم حکمراں، قاتل اور انگلینڈ کی دولت مشترکہ کا دشمن ہونے کے الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا۔ بادشاہ پر یہ مقدمہ ویسٹ منسٹر میں ایک سو پینتیس 135 آدمیوں کی موجودگی میں چلایا گیا۔ جو اس مقدمے کے جج مقرر کیے گئے تھے۔ چارلس نے ان لوگوں کے مقدمہ چلانے کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور جرم کا اقبال بھی نہیں کیا۔اسے موت کی سزا ہوئی۔اس کی موت کے وارنٹ پر جس کے تحت اسے موت کی سزا ہوئی صرف ترپن 53 ججوں نے دستخط کیے ان میں سے ایک تھامس چالونر تھا۔

لیکن یہ روایتی کہانی چارلس کی موت پر ختم نہیں ہوئی۔اس کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح تھامس چالونر کرمویل کے ذریعہ آئل آف مین Isle of Man کا گورنر بنایا گیا جہاں وہ 1660 تک ایک قلعہ میں نہایت آرام و آسائش کے ساتھ رہا۔اس سال اسٹارٹ لائن کو دوبارہ قائم کیا گیا اور چارلس دوم کی بادشاہ کی حیثیت سے تاجپوشی ہوئی۔ وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ ان تمام لوگوں کو معاف کردے گا جنھوں نے اس کے باپ کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا۔لیکن ان ججوں کو معاف نہیں کرے گا جنھوں نے مقدمہ میں حصہ لیا تھا۔

چالونر نے آئل آف مین میں آکر یہ دہشت ناک خبر سنی کہ بادشاہ کے سپاہی اسے گرفتار کرنے آرہے ہیں۔اس نے اپنی نوکرانی سے شراب لانے کو کہا اور پھر شراب میں زہر ڈال دیا جو وہ اس موقع کے لیے رکھے ہوئے تھا اور پی گیا۔ جب چارلس کے سپاہی قلعے میں داخل ہوئے تو اسے مرا ہوا پایا۔

پھٹکری کے متعلق کہانیاں حقیقت اور افسانوں کا سنگم ہیں۔ اٹلی میں اس کی دریافت کا حال پوپ پائس دوم نے قلم بند کی ہے اس لیے اسے صحیح مانا جاتا ہے۔ پھٹکری کے پتھروں کی چالونز کی اتفاقیہ دریافت کا بیان گیسبرو کی دریافت کی کہانی سے اتنا زیادہ ملتا جلتا ہے کہ یہ یقین کرنا بجا ہوگا کہ پہلی دریافت کا بیان دوسری کہانی میں شامل کرلیا گیا ہے۔

بہر حال یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ چالونز نے پھٹکری بنانے کا کام گیسبرو میں یا تو الزبیتھ کے دور میں یا جیمس اول کے زمانے میں شروع کر دیا تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ چارلس اول کے دور میں یہ شاہی ملکیت ہوگئی تھی۔

وہٹبی Whitby (جو گیسبرو کے قریب ہے) کے ایک تاریخ داں نے باقی کہانی کو جھوٹ کہہ کر رد کر دیا کیونکہ یہ وقت اور شخص دونوں کے لحاظ سے غلط ہے۔ اس نے اس بات کا انکشاف کیا کہ یہ تین چالونزوں کو آپس میں گڈ مڈ کرتا ہے۔ پہلے چالونزس سر تھامس تھے جنھوں نے اس کام کی بنیاد ڈالی، پھر دوسرا تھامس آیا جو اُن کا بیٹا تھا جو ممتاز عالم اور پارلیامنٹ کا ممبر اور بادشاہ کے ججوں میں سے ایک تھا اور اس کے دستخط چارلس اسٹارٹ کے موت کے وارنٹ پر تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور بھائی جیمس تھا، وہ بھی پارلیامنٹ کا ممبر اور ایک جج تھا۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اس خاندان نے پارلیامنٹ کا ساتھ دیا اور یہی وجہ نظر آتی ہے کہ پھٹکری کا کاروبار کرنے پر ان پر زیادتیاں کی گئیں۔

1960 میں شہنشاہیت کے دوبارہ قائم ہونے پر سر تھامس کا انتقال ہوگیا اور ان کا بیٹا تھامس ہالینڈ بھاگ گیا جہاں وہ آخری دم تک رہا۔ لیکن کہانی کے مطابق جیمس آئل آف مین میں رہا اور پھر اسے لندن بلالیا گیا۔ بادشاہ کو موت کے گھاٹ اتارنے میں جو اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کے نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے زہر کھالیا جیسا کہ کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔

اس لیے یہ غالباً صحیح ہے کہ پھٹکری کی کہانی کا آخری حصہ سر تھامس چالونز اور اس کے دو بیٹوں، تھامس اور جیمس کی زندگی کے واقعات اور قصوں پر مبنی ہے۔ ▫

قومی اردو کونسل کی مطبوعہ کتاب 'سائنس کی کہانیاں' جلد اول، سے ماخوذ

اپنے وطن میں

ڈاکٹر نریش

راجستھان کا آبو پربت

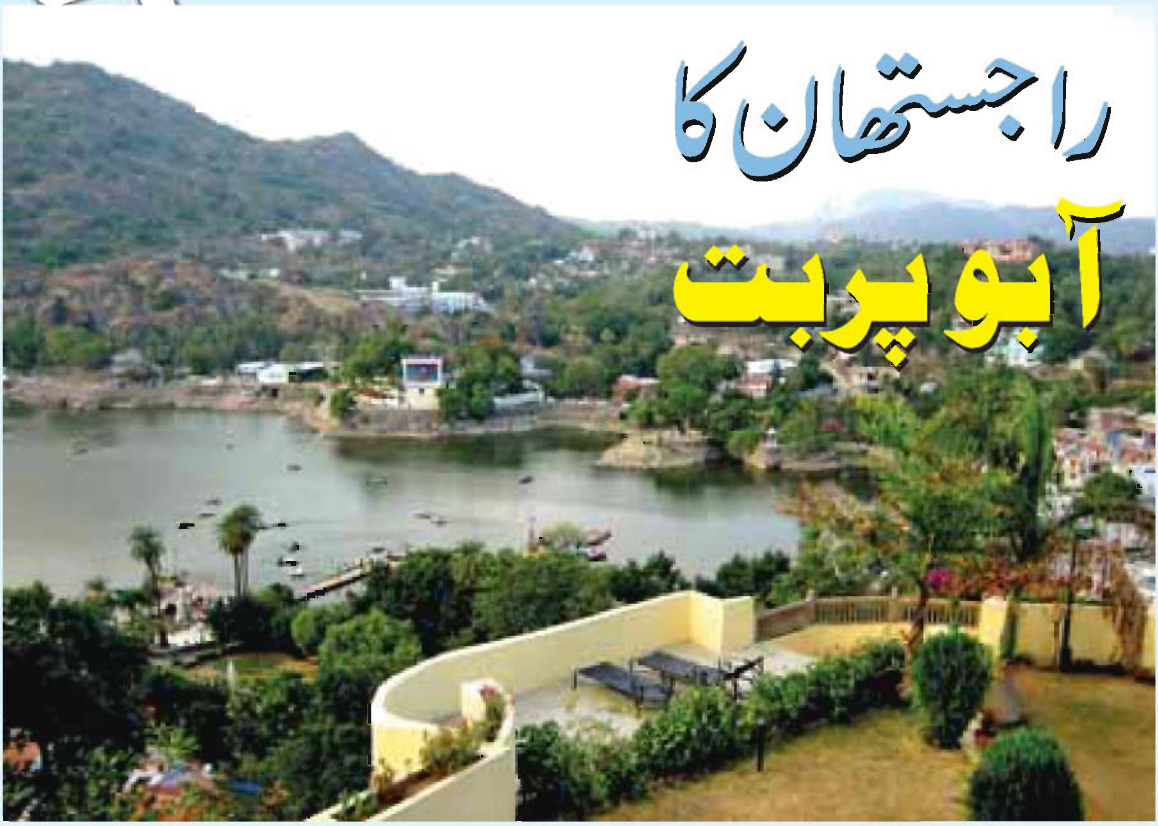

راجستھان کا آبو پربت جینیوں کی بہت مقدس زیارت گاہ ہے۔انگریزی میں یہ مقام ماؤنٹ آبو کے نام سے مشہور ہے۔یہ راجستھان کا واحد ہل اسٹیشن ہے جو اَراولی پہاڑی سلسلے کے تحت صوبہ گجرات کی سرحد کے قریب واقع ہے۔اس کی چوڑائی 9 کلومیٹ اور لمبائی 22 کلومیٹر ہے۔اس کی سب سے اونچی پہاڑی کو گروشکھر کہتے ہیں جو سمندر کی سطح سے 1722 میٹر اونچی ہے۔

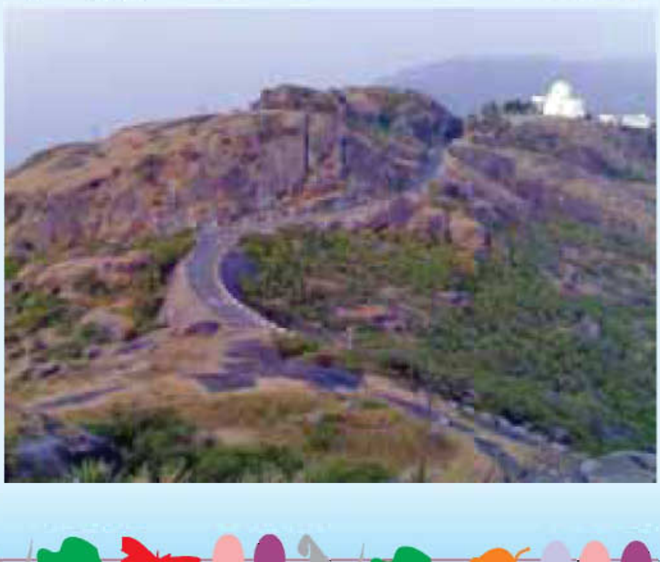

راجستھان کے ریگستانی صوبے میں اس علاقے کو ایک خوب صورت نخلستان کہا جاسکتا ہے۔

ماؤنٹ آبو کی تاریخ بہت پرانی ہے۔اس کا پراچین نام اربدانچل ہے۔ چالوکیا خاندان کے راجہ بھیم سین کے دورِ حکومت میں جین دھرم کی زبردست تبلیغ ہوئی تھی۔اس کے وزیر وِمَل شاہ نے آبو پہاڑ پر بھگوان آدی ناتھ کا مندر بنوایا جو اپنے فنِ تعمیر اور حسن بت سازی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔سن 1230 عیسوی میں پرووار سیٹھ تیج پال نے اس مندر کے قریب ہی بھگوان نیمی ناتھ کا مندر تعمیر کرایا۔اس

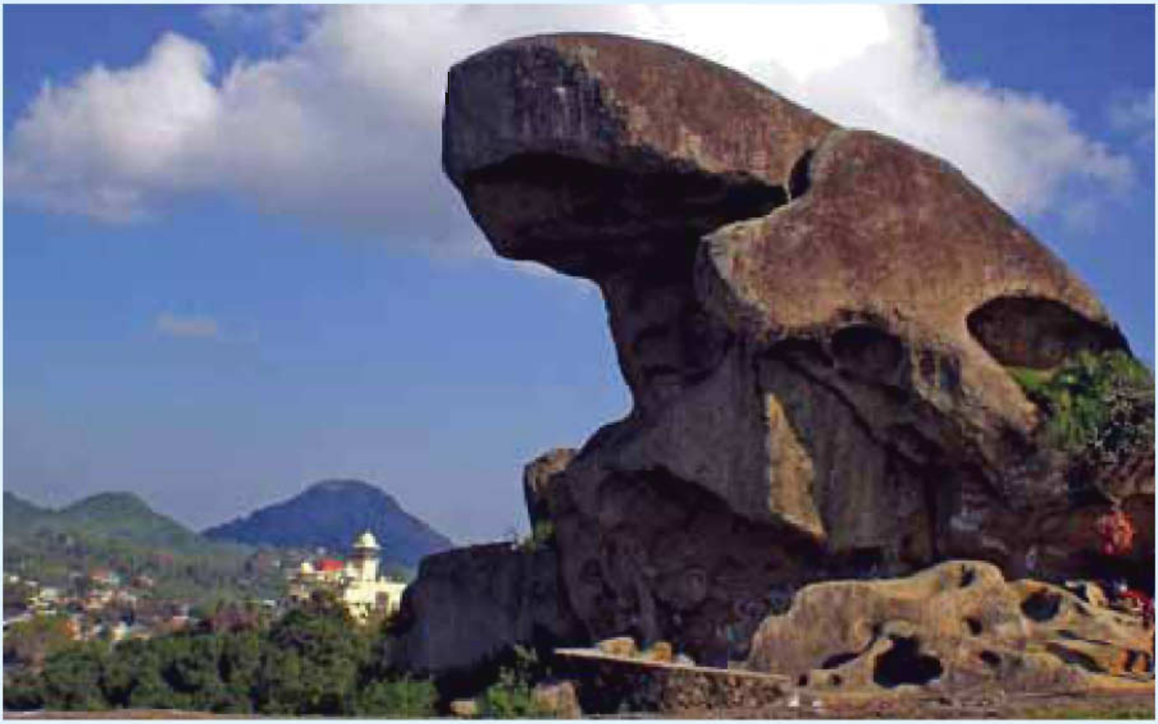

▲ ٹوڈراک: ماؤنٹ آبو کی مشہور چٹان جو کسی مینڈک کی شبیہ پیش کرتی ہے

مندر کے حسنِ تعمیر کا مقابلہ وٹل شاہ کے مندر ہی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ مندر اگر اس سے اکیس نہیں ہے تو انیس بھی نہیں ہے۔

12ویں اور 13ویں صدی میں آبو پربت پر مزید کئی مندر تعمیر کیے گئے۔ مندروں کی کثیر تعداد کے سبب ہی اس جگہ کا نام 'دلواڑہ' یعنی 'دیوتاؤں کا نگر' پڑ گیا۔ آبو شہر کے قریب سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر نہایت وسیع گھیرے میں 'وٹل وسہی'، 'لون وسہی'، 'پتلہر'، 'چومکھا' اور 'مہاویر سوامی' نام کے پانچ عظیم الشان مندر موجود ہیں۔ 'وٹل وسہی' وسل شاہ نے بنوایا تھا۔ لون وسہی کی تعمیر تیج پال اور ستو پال نام کے دو بھائیوں نے کرائی تھی، جو ڈھولکا کے بگھیل راجہ ویر دھول کے وزیر تھے۔ 1232 میں چونکہ اس مندر کی تعمیر تیج پال کے بیٹے لون شاہ کی یادگار کے طور پر کرائی گئی تھی اس لیے اس کا نام لون وسہی رکھا گیا۔ پتل پر کی تعمیر گوجر قوم کے بھیم شاہ نے کرائی تھی۔ اس میں موجود 1483 کی ایک چٹانی تحریری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مندر کو کئی گاؤں بطور جاگیر بھی عطا کیے گئے تھے۔

چوہان راجہ راجدھر کے دورِ حکومت میں اس مندر کے زائرین سے ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ اس مندر کا نام پتلہر رکھے جانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر بھگوان آدی ناتھ کی جو مورتی ہے وہ پیتل کی بنی ہوئی ہے اور اس کا وزن آٹھ من ہے۔ چومکھا مندر میں بھگوان پارسوناتھ کی چار منہ والی مورتی قائم ہے۔ اس مورتی کی استھاپنا

کھرترگچھ کے منیوں نے کی تھی، اس لیے اسے 'کھرتروسہی' بھی کہاجاتا ہے۔ یہ مندر سہ منزلہ ہے اور اس کی ہر منزل پر بھگوان پارسوناتھ کی چومکھی مورتی براجمان ہے۔ مندر کے شمال مشرق میں بھگوان مہاویر کا وہ مندر موجود ہے، جس کی تعمیر 15ویں صدی میں عمل میں آئی تھی۔

یہاں یہ جان لینا بھی مناسب ہوگا کہ جینیوں کے مقدس مقامات دوطرح کے ہیں۔ ایک وہ مقامات جہاں کسی تیرتھنکر کونروان حاصل ہوا تھا یا جہاں پراس کی پیدائش ہوئی تھی۔ دوسرے مقدس مقامات وہ ہیں جہاں تیرتھنکروں کی مورتیاں قائم کر کے مندر بنے اور کثیر تعداد میں زائرین وہاں اظہارِعقیدت کرنے لگے۔ پہلی قسم کے مقامات میں پاواپور، گرنار، چمپا اور شرنجے بہت مشہور مقامات ہیں۔ راجستھان کا آبو پربت دوسری قسم کے مقامات میں ایک نہایت اہم مقام ہے۔

جین فلسفہ کے مطابق جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے تب

◄ماؤنٹ آبو کا دیدہ زیب جین مندر

▲ خوب صورت نقاشی سے سجا ہوا دلواڑہ مندر کا اندرونی حصہ

سے لے کر آج تک چوبیس ایسی عظیم شخصیات اس زمین پر آئی ہیں جو قابل پرستش ہیں۔ ان کو تیرتھنکر کہا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے ہر شخصیت کا مرتبہ ایک تیرتھ یعنی مقدس مقام جیسا ہے۔ سب سے پہلے تیرتھنکر آدی ناتھ تھے اور 24ویں تیرتھنکر بھگوان مہاویر تھے۔ آپ کے لیے یہ جان لینا بھی دلچسپ ہوگا کہ جینیوں کا 'دگمبر' فرقہ مقدس مقامات میں بے پناہ عقیدت رکھتا ہے اوران مقامات کے درشن کا انھیں بے حد پسند ہے۔ جب کہ دوسرا فرقہ جسے 'شیوتیامبر' کہتے ہیں، دگمبروں کی طرح ان مقامات کا شیدائی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں دگمبروں اور بت پرست جینیوں کے مقامات زیارت کی تعداد بہت بڑی ہے جبکہ شیویتامبروں کے مقدس مقامات کی تعداد کم ہے۔

عام طور پر جینیوں ں کے مقامات زیارت شہر کی آبادی سے دور کسی پہاڑ کی غار میں جنگل میں بنائے جاتے تھے تاکہ عقیدت رکھنے والوں کوسکون اور تنہائی میسر آسکے۔

یہاں ہندوؤں کے بھی مندر ہیں جن میں اربدا دیوی کا مندر اور درگا مندر مشہور ہیں۔

آبو پربت صدیوں سے لوگوں کو راجستھان اور گجرات کی گرمی سے نجات دینے والے پرفضا مقام کے طور پر اپنی طرف کھینچتا رہا ہے۔ آج بھی یہ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے کسی جنّت سے کم نہیں۔ یہاں جنگلی جانوروں کی محفوظ پناہ گاہ Sanctuary بھی ہے۔ مئی جون میں یہاں درجہ حرارت 36 ڈگری سیلسیس کے آس پاس رہتا ہے۔ مانسون کے دنوں میں یہ کم ہوجاتا ہے۔ سردیوں میں درجہ حرارت 4 سے 22 ڈگری کے درمیان رہتا ہے اور کئی بار صفر سے دو یا تین ڈگری نیچے بھی چلا جاتا ہے۔

ماؤنٹ آبو باقی ملک سے ریل، ہوائی جہاز اور سڑک کے ذریعہ جڑا ہوا ہے۔ دہلی، جے پور اور احمداباد سے یہاں ٹیکسی سروس کے ذریعے بھی بہ آسانی پہنچا جاسکتا ہے۔ ◻

Dr Naresh
169, Sector 17, Panch Kula-134109

کامکس
اسٹوری

ننھے ریچھ
کی اچھی باتیں

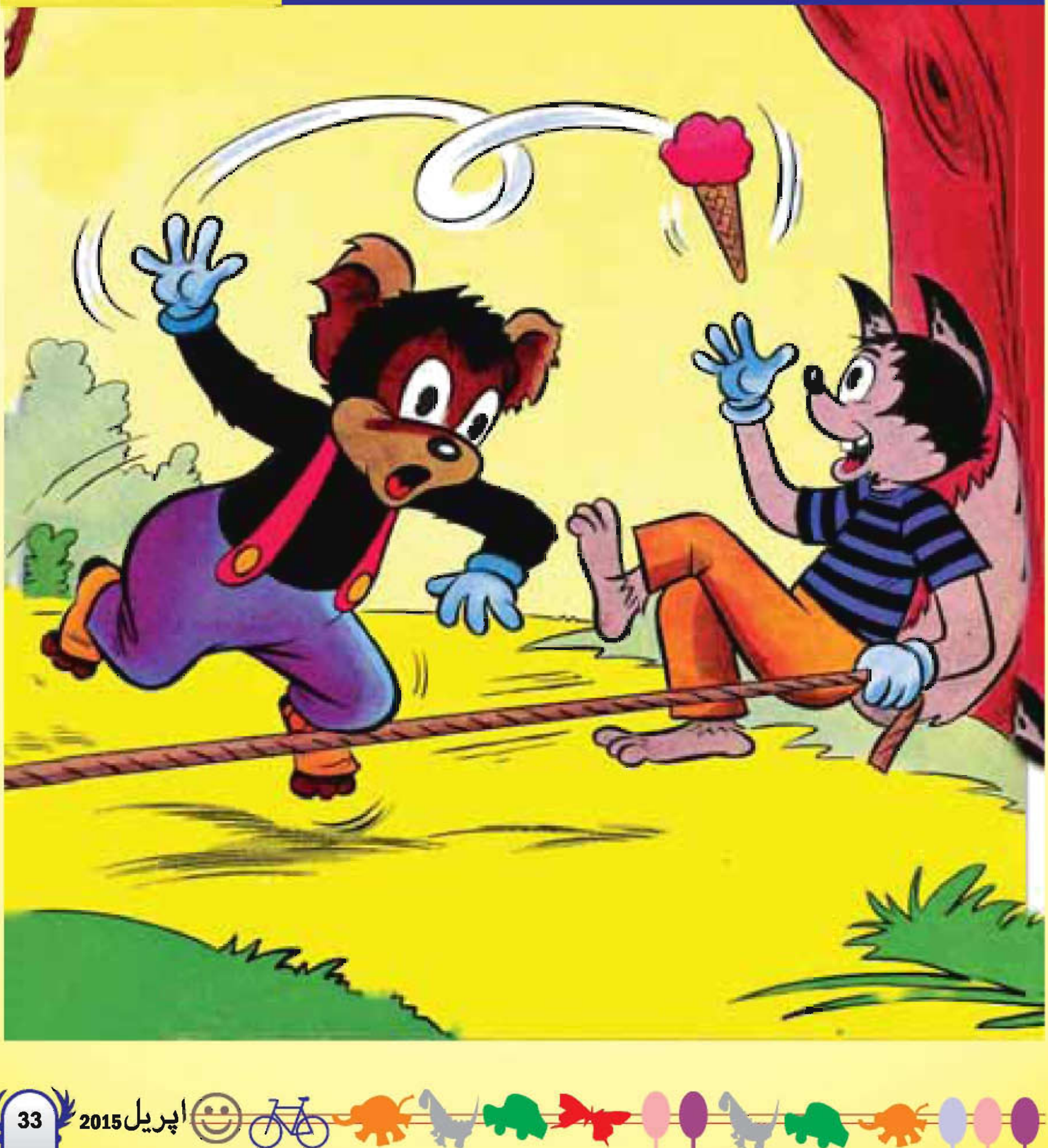

دروغ گوئی سے بچو!

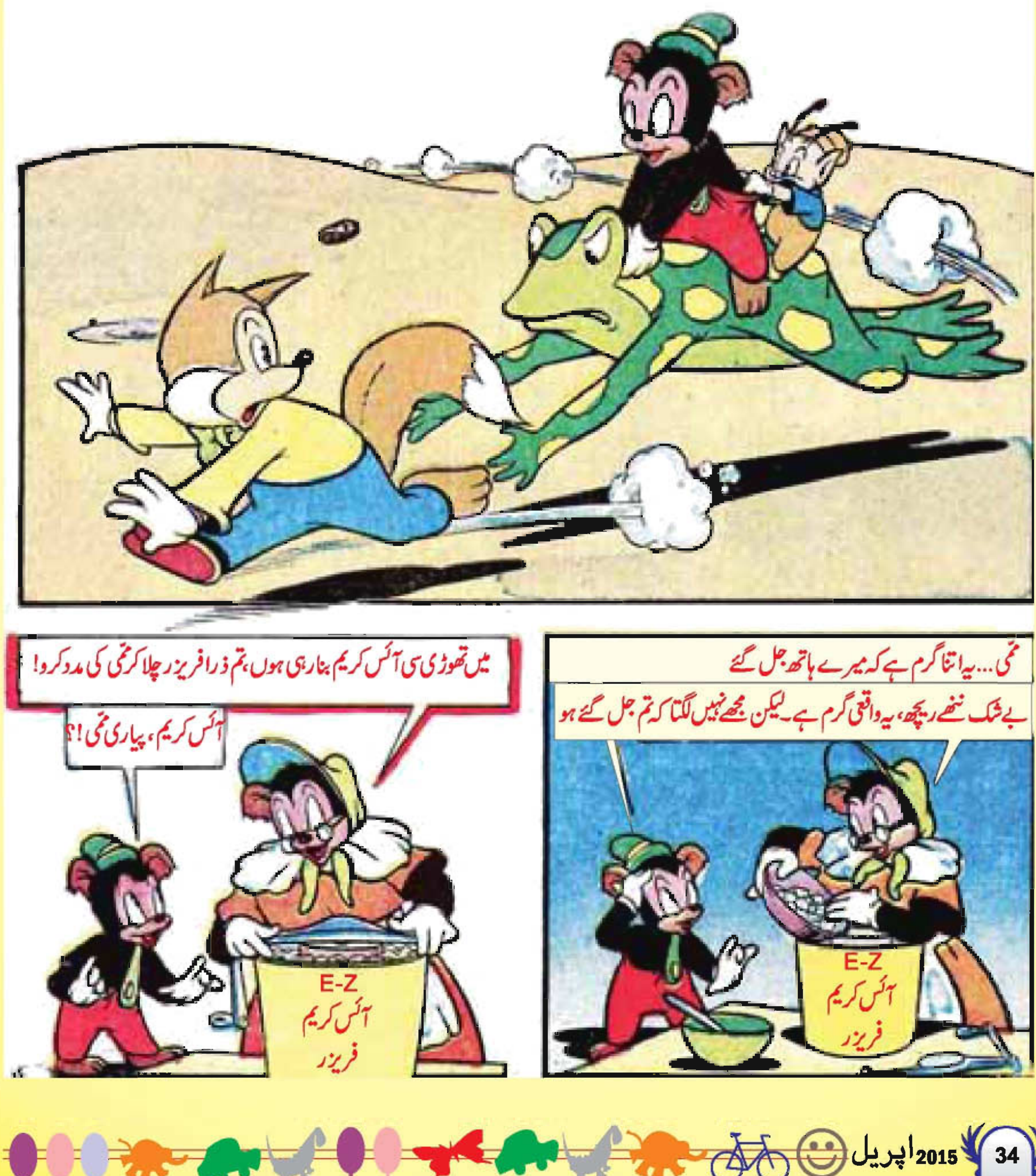

اب تمھیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اسے گھماتے رہو
اس میں چاکلیٹ بھی ہے؟
E-Z
آئس کر
فر
آہا! لگتا ہے میں کئی ٹن آئس کریم بنالوں گا!
E-Z
آئس کریم
فریزر
ننھے! کیا تم کئی ٹن آئس کریم بنانے کی بات کہہ رہے تھے
ہاں ممی!
E-Z
آئس کریم
دیکھو ننھے! کبھی کوئی بات بڑھا چڑھا کر مت بولو، ورنہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو...
تو لوگ تمھاری کسی بات پر یقین نہیں کریں گے!
یہ تو اچھا نہیں ہوگا
E-Z
کریم
بالکل!...اچھا اب تم جا کر کھیلو، بعد میں تمھیں تھوڑی سی آئس کریم مل جائے گی
ٹھیک ہے ممی اور اب میں بڑا بول نہیں بولوں گا
E-Z

ممّی ٹھیک ہی کہتی ہیں، کسی بات کو بڑھا کر بولنا غلط ہے!
ہیلو، فوکسی!
ہائی ننھے! میں ابھی تالاب سے آ رہی ہوں، جانتے ہو میں نے وہاں کیا دیکھا؟
کمل کا پھول؟
ایک بوڑھا مینڈک، جو ہاتھی جتنا بڑا تھا!
واؤ! میری بات سنو فوکسی، اب تم بڑی ہو گئی ہو، باتوں کو یوں بڑھا کر نہیں بولنا چاہیے! اسے دروغ گوئی کہتے ہیں، جو اچھی عادت نہیں ہے
مگر میں نے جو کہا ٹھیک ہے اور اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گی
ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو ایسا ہی ہوگا، مگر اس سے تم مشکل میں پڑ جاؤ گی!
اچھا اب میں چلتی ہوں... مگر ایک دن تم وہ مینڈک دیکھو گے ضرور!

میں خود تالاب پر جا کر دیکھتا ہوں...
ہاتھی جتنا مینڈک ہوتا ہے یا نہیں؟
ارے یہ تو اتنا ہی بڑا ہے جتنا میں سوچتا تھا...عام سائز کا مینڈک!
ہائے ننھے!
اوہ، ننھی پری! کیا اس تالاب میں کوئی ہاتھی جتنا بڑا مینڈک رہتا ہے؟
نہیں تو! کون کہتا ہے؟
فوکسی کہتی ہے اس نے دیکھا ہے!
یہ تو بری بات ہے! چلو اس سے مزا لیتے ہیں
وہ رہی فوکسی!!
سنو ننھے! میں اس پر تھوڑا سا جادو کروں گی۔ مگر تم ڈرنا نہیں!
فوکسی میں ننھی پری کو بتا رہا تھا کہ تم نے ہاتھی جتنا مینڈک دیکھا ہے!
وہ واقعی ایک مکان جتنا بڑا تھا...

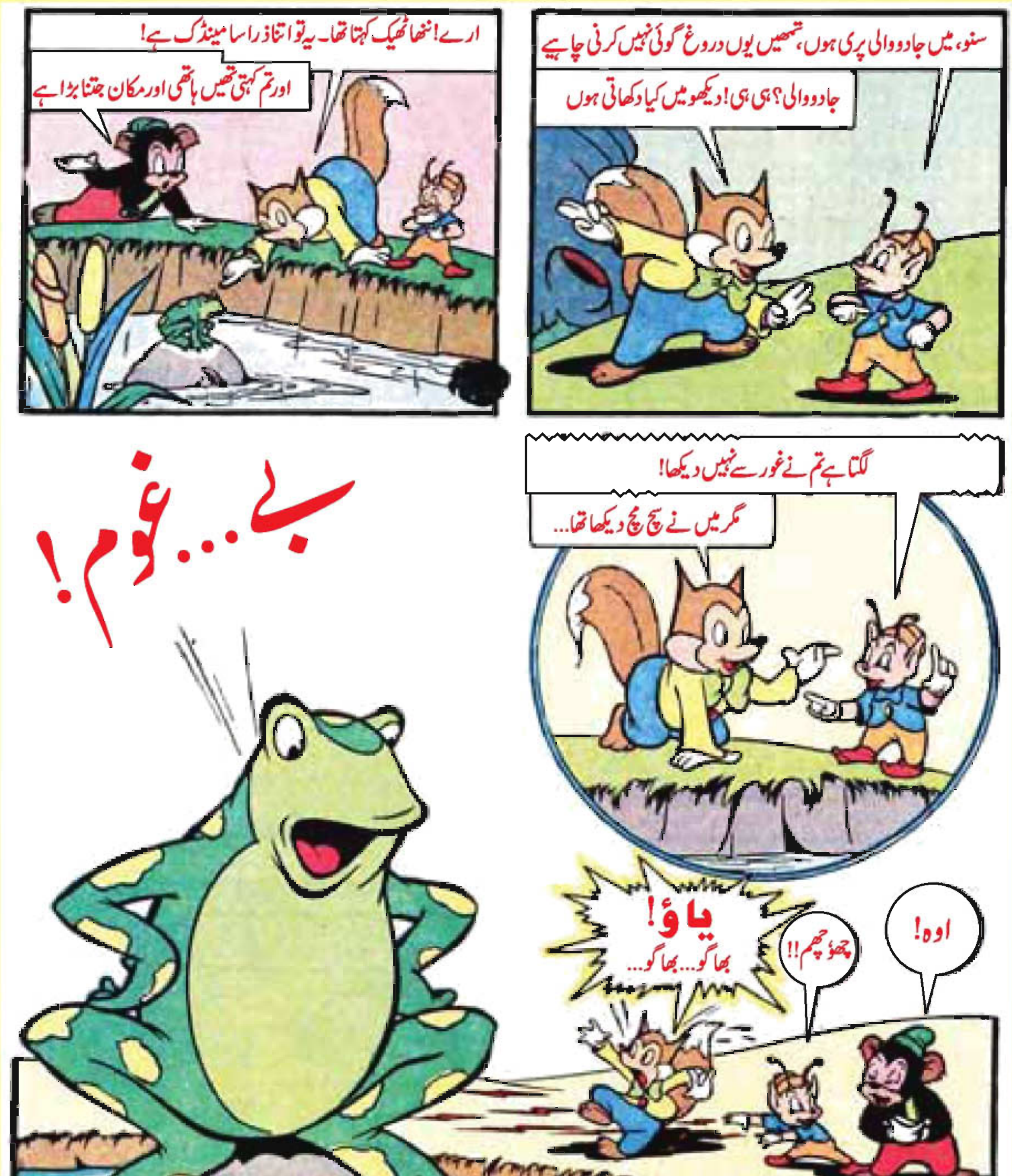
سنو، میں جادو والی پری ہوں، تمھیں یوں دروغ گوئی نہیں کرنی چاہیے
جادو والی؟ ہی ہی! دیکھو میں کیا دکھاتی ہوں
ارے! ننھا ٹھیک کہتا تھا۔ یہ تو اتنا ذرا سا مینڈک ہے!
اور تم کہتی تھیں ہاتھی اور مکان جتنا بڑا ہے
لگتا ہے تم نے غور سے نہیں دیکھا!
مگر میں نے سچ مچ دیکھا تھا...
ب...غوم!
اوہ!
چھؤ چھم!!
یاؤ!
بھاگو...بھاگو...

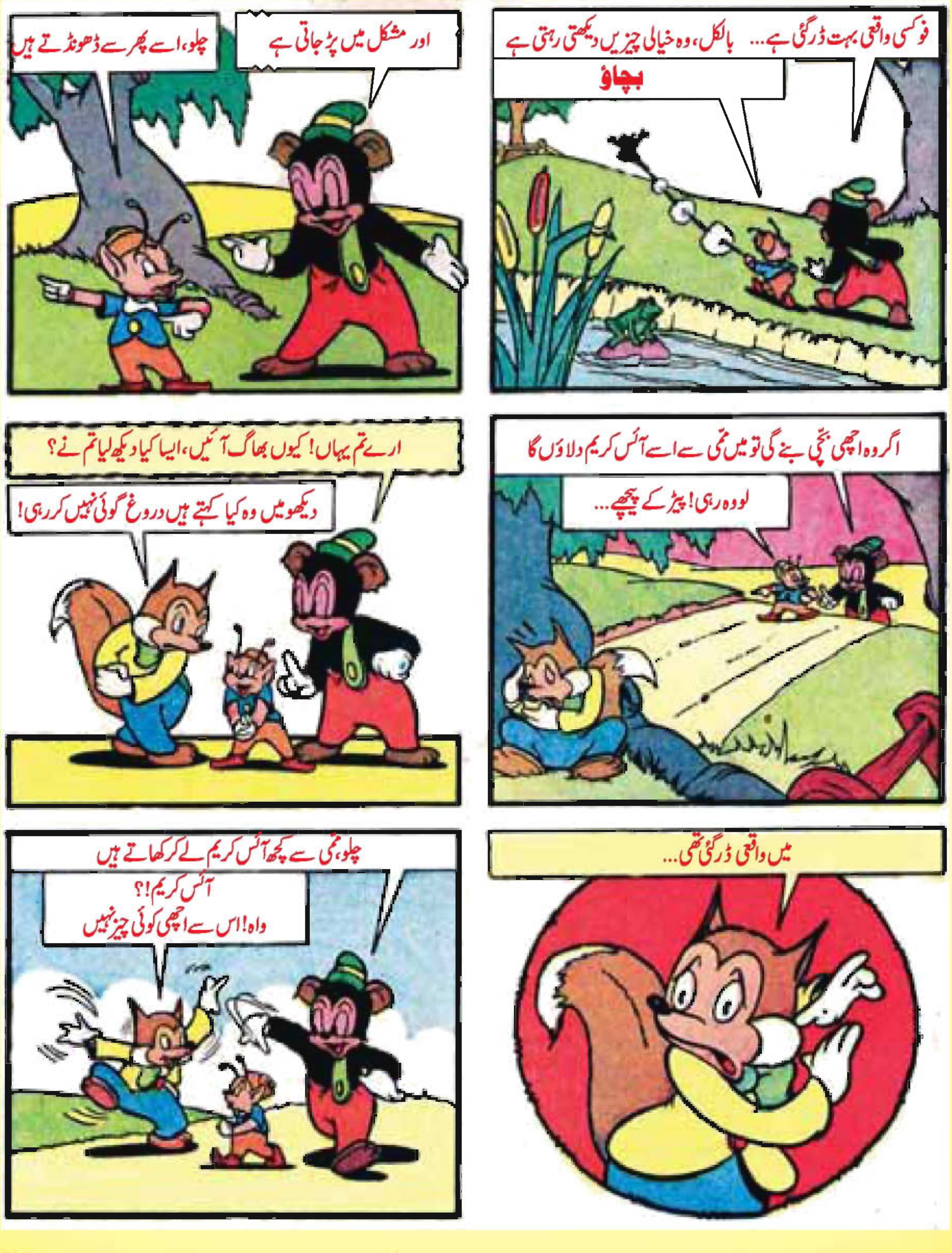

فوکسی واقعی بہت ڈر گئی ہے...
بالکل، وہ خیالی چیزیں دیکھتی رہتی ہے
بچاؤ
اور مشکل میں پڑ جاتی ہے
چلو، اسے پھر سے ڈھونڈتے ہیں
اگر وہ اچھی بچّی بنے گی تو میں ممی سے اسے آئس کریم دلاؤں گا
لو وہ رہی! پیڑ کے پیچھے...
ارے تم یہاں! کیوں بھاگ آئیں، ایسا کیا دیکھ لیا تم نے؟
دیکھو میں وہ کیا کہتے ہیں دروغ گوئی نہیں کر رہی!
میں واقعی ڈر گئی تھی...
چلو، ممی سے کچھ آئس کریم لے کر کھاتے ہیں
آئس کریم!؟
واہ! اس سے اچھی کوئی چیز نہیں

Buster Bear سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

نانی کا صندوق

شیلیندر

چھُن چھُن کرتی آئی چڑیا

چھُن چھُن کرتی آئی چڑیا
دال کا دانہ لائی چڑیا
مور بھی آیا
کوّا بھی آیا
چوہا بھی آیا
بندر بھی آیا
خوں خوں خوں خوں

چلتے چلتے ملے گا بھالو
ہم بولیں گے ناچو کالو
منّا ڈھول بجائے گا
بھالو ناچ دکھائے گا
مور بھی آیا
کوّا بھی آیا
چوہا بھی آیا
بندر بھی آیا
خوں خوں خوں خوں

بھوک لگی تو چڑیا رانی
مونگ کی دال پکائے گی
کوّا روٹی لائے گا
لاکے تجھے کھلائے گا
مور بھی آیا
کوّا بھی آیا
چوہا بھی آیا
بندر بھی آیا
خوں خوں خوں خوں

ساتھ ہمارے چلے براتی
میں تو ہوں منّے کا ہاتھی
سیدھا دلّی جاؤں گا
تری دلہنیا لاؤں گا
مور بھی آیا
کوّا بھی آیا
چوہا بھی آیا
بندر بھی آیا
خوں خوں خوں خوں

چھُن چھُن کرتی آئی چڑیا
دال کا دانہ لائی چڑیا
مور بھی آیا
کوّا بھی آیا
چوہا بھی آیا
بندر بھی آیا
خوں خوں خوں خوں

عظیم اقبال

بے وقوف دولہا

کردار: خالد (نو عمر لڑکا)، شریف الحسن (خالد کے والد)، مہرالنسا (خالد کی والدہ)، عابد علی (خالد کے سسر)، آمنہ خاتون (خالد کی ساس) اور زینب (خالد کی دولہن)

قہقہوں کے ساتھ پردہ اٹھتا ہے

منظر: 1

ایک بڑا کمرہ، جہاں ایک جانب داخلہ ہے جس پر رنگین پردہ لٹک رہا ہے۔ ایک گوشے میں دیوار سے ذرا پرے ایک تخت ہے، جس پر خوبصورت قالین بچھی ہے اور اس پر ایک گاؤ تکیہ لگا ہے۔ تین کرسیاں، دو دائیں بائیں اور ایک سامنے رکھی ہے۔

خالد: (اندر آتا ہے، اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھلی ہے، ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے، کتاب کھول کر صفحات پلٹتے ہوئے خود سے کہتا ہے) ان دنوں سب پر مردنی چھا گئی ہے۔ بھیگی پھل جھڑی بن گئے ہیں۔ ڈھنگ کا لطیفہ بھی نہیں چھاپتے۔ کوئی بے ساختگی نہیں، جدیدیت در آئی ہے۔ کوئی سر ہے نہ پیر ہے (سنجیدہ ہوکر) بھلا یہ کیا لطیفہ ہے۔ ہنسی آئی ہی نہیں، آتے آتے بیچ میں رک گئی۔ جسے پڑھ، سن کر آدمی ہنسی سے بیگانہ ہوجائے وہ بھی کوئی لطیفہ ہے کیا ہے۔ یہ غالب کا کوئی شعر ہے کیا جسے سمجھنے کے لیے دماغ پر زور لگانا پڑے؟

مہرالنسا: (اس دوران کمرے میں آتے ہوئے) کیا بک بک کر رہا ہے بیٹا! میں سمجھی کسی سے بات کر رہا ہے۔

خالد: سر دھن رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کلیجہ بھی کوٹوں اور چھاتی

بھی پیٹوں۔

مہرالنسا: یہ سب تو بعد میں بھی کر سکتے ہو۔ ابھی تو سسرال جانے کے لیے کمر کس لو۔ بیگ نکال لو۔ چند جوڑے کپڑے رکھ لو۔

خالد: کیوں؟ میں کیوں جاؤں؟ سسرال میں رہوں گا کیا؟ لڑکے کی شادی ہوتی ہے تو بیوی سسرال جاتی ہے۔ بتائیے، گھر میں چھوڑوں، یا بیوی چھوڑے گی۔

مہرالنسا: تم تو مہمان بن کے جاؤ گے، مہمان ہمیشہ کہیں رہتا ہے کیا؟ سسرال میں کیا گھر جمائی بن کے رہنا ہے۔

خالد: کیا کروں گا وہاں؟ شادی ہوئی تھی تو گیا تھا کہ نہیں؟ اتنی جلدی کیوں بلالیا؟ (رکتا ہے) یہاں کتنا کام پڑا ہے۔ چلا گیا تو گلاب کون سینچے گا؟ پوسی کو کون کھلائے پلائے گا؟

مہرالنسا: چند دن کے لیے بلایا ہے۔ سب سے مل ملا لو۔ سگے، سمبندھی بھی آئے ہیں۔

شریف الحسن: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) بیٹے کو کہاں بھیج رہی ہیں آپ؟ اسے آرام بھی نہیں کرنے دیتیں۔

مہرالنسا: اپنی سسرال جانا ہے۔ سندیسہ آیا ہے۔ اسے بتا دیجیے، وہاں کیسے رہے گا۔ کیا بولے گا، کیا نہ بولے گا، زیادہ بولے گا تو عزت خاک میں ملے گی، اس سے کہیے باتونی نہ بنے۔ گھر کی بات دوسروں سے نہ کہے۔ جو چاہو بولو!

خالد: (جھنجلا کر کتاب بند کرتا ہے) آپ نے تو جیسے مجھے بچہ سمجھ لیا ہے!

والد والدہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں

قہقہوں کے ساتھ پردہ

منظر:2

وہی کمرہ۔ اب کرسیاں ہٹادی گئی ہیں۔ تخت پر گاؤ تکیہ کی ٹیک لگائے شریف الحسن بیٹھے ہیں۔ سامنے سر جھکائے خالد بیٹھا ہے

شریف الحسن: کوئی سوال کرے تو جواب میں جلدی نہ کرنا۔ سوچنا پھر بولنا۔

مہرالنسا: (چائے کی ٹرے کے ساتھ اندر آتی ہیں) اچھی نہیں بنی ہے۔ کروں کیا؟ دودھ ہی اچھا نہیں آتا، شکایت سے عاجز آگئی۔

خالد: بازار سے ایک بھینس کیوں نہیں لے آتیں۔ دودھ کی شکایت نہ ہوگی۔

شریف الحسن: (ترش روئی سے) بولنے سے پہلے سوچتے کیوں نہیں ہو۔

خالد: (کان پکڑتا ہے) ٹھیک ہے! اب سوچوں گا۔

مہرالنسا واپس جاتی ہیں

شریف الحسن: کان کیوں پکڑتے ہو؟ کان تو بچے پکڑا کرتے ہیں اسکول کی کلاس میں۔

خالد: (مچل کر) میں آپ کا بچہ نہیں ہوں کیا؟

شریف الحسن: ہوں کیوں نہیں۔ لیکن اب بڑے ہو۔ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ کل تم اپنی سسرال جاؤ گے۔

خالد: کیوں جاؤں گا۔

شریف الحسن: گھومنے، پھرنے، ملنے، ملانے جاؤ گے۔ (رکتا ہے) وہاں کئی لوگ اجنبی ملیں گے۔

خالد: اجنبی کیوں؟

شریف الحسن: تمہارے لیے نئے ہوں گے ان سے کم بولنا۔

خالد: وہ زیادہ بولیں گے کیا؟

شریف الحسن: اِدھر، اُدھر کی باتیں کریں گے۔

خالد: میں چپ چاپ سنوں گا۔ یہی نا؟

شریف الحسن: سننا زیادہ، بولنا کم۔

خالد: جی چاہے گا تو کچھ پوچھوں گا کہ نہیں؟

شریف الحسن: پوچھو گے کیوں نہیں! بہرے، گونگے تو نہیں۔

خالد: ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ (منہ کھول کر زبان باہر نکالتا ہے)

شریف الحسن: (جھنجلا کر) منہ بند کرو۔

خالد: اچھا زبان بند۔ منہ بھی بند۔ (کان کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ روکتا ہے) نہیں! یہ نہیں! اب بچہ نہیں ہوں، بڑا ہوں (پہلے اثبات میں پھر نفی میں سر ہلاتا ہے) کل سسرال جاؤں گا۔

قہقہوں کے ساتھ پردہ

منظر:3

تخت پر دوسرا قالین بچھا ہے۔ دیوار پر مذہبی نوعیت کے کیلنڈر آویزاں ہیں۔ ایک جانب میز ہے، آس پاس کرسیاں ہیں۔ ایک

کرسی پر خالد ہے، سامنے کرسی پر عابد علی ہیں

عابد علی: تکلف چھوڑو۔ اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔ آرام سے رہو۔

خالد سر جھکائے رہتا ہے

عابد علی: کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ ہو تو بتانا

خالد: (نفی میں سر ہلاتا ہے) نہیں ہوئی

عابد علی: کھانا ٹھیک سے کھایا؟

خالد: (اثبات میں سر ہلاتا ہے) ہاں کھایا۔

عابد علی: جتنی تعریف سنی تھی، اس سے بھی زیادہ تعریف کے قابل ہو، جو بھی کہوں، کم ہے۔

خالد: (سنجیدہ صورت بنائے رہتا ہے، پھر جیسے خود سے کہتا ہے) تعریف اس خدا کی جس نے ہمیں بنایا۔

آمنہ خاتون چائے کی ٹرے کے ساتھ آتی ہیں

خالد: (احتراماً اٹھ جاتا ہے) کیوں تکلیف کی؟ آواز دے لیتیں۔

آمنہ خاتون: (مسکرا کر) بیٹھو، بیٹھو!

عابد علی: کہتا نہ تھا، داماد کھرا سونا ملا ہے۔ انکساری دیکھیے، سنجیدگی دیکھیے، مرحبا! مرحبا! کبھی سوچا نہ تھا کہ بیٹی کو اتنا اچھا جوڑا ملے گا۔

آمنہ خاتون: (ٹرے رکھتی ہے) ہزاروں کیا، لاکھوں میں ایک ہے ہمارا بیٹا۔ خوش بخت ہے ہماری بیٹی، خدا مہربان ہوا ان پر۔

عابد علی: زینب کہاں ہے؟ اب تک نہیں آئی۔

آمنہ خاتون: بس آ رہی ہے۔ (مڑ کر دیکھتی ہے) لیجیے! آ گئی۔

زینب سر جھکائے آتی ہے اور آمنہ خاتون کے پاس بیٹھ جاتی ہے

عابد علی: اپنی کزنس کو فون کیا؟ کوئی سہیلی بھی آئے گی۔

زینب: (اثبات میں سر ہلاتی ہے) چند آئیں گی۔

خالد: (خود سے بات کرتے ہوئے) مجھے بھی کچھ پوچھنا چاہیے۔ کس سے پوچھوں؟ کیا پوچھوں؟ (سر کھجاتا ہے)

عابد علی: کیا بات ہے بیٹا! کچھ کہنا چاہتے ہو؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔

خالد: (اسی طرح خود کلامی کرتے ہوئے) زبان بند نہیں رہ سکتی۔ گونگا ہوں کیا؟ کچھ پوچھنا ہی چاہیے۔

عابد علی: بولو بیٹا! کچھ تم بھی بولو۔

خالد: (جھجکتے ہوئے) ابا جی! بس ایک بات پوچھنی ہے۔ کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟

عابد علی، آمنہ خاتون، زینب سکتے ہیں۔ سب کے منہ کھلے ہیں

قہقہوں کے ساتھ پردہ گر جاتا ہے

Azim Iqbal
Adaqistan Ganj No. 1
Bettiah - 845438 (Bihar)

علیم صبا نویدی

ہمارا اسکول

ہمارا اسکول سب سے پیارا
غریب بچوں کا ہے سہارا

ہے اس کے دل میں ہماری دھڑکن
یہ ہے ہماری خوشی کا درپن
ہے اس کے دل میں لہو ہمارا
ہمارا اسکول سب سے پیارا

ہیں اس کی بانہوں میں چاند تارے
مہکتے گاتے حسیں نظارے
نگاہِ بد سے بچا خدارا
ہمارا اسکول سب سے پیارا

ہے اس کی دل کش فضا نرالی
ہے اس کی سرسبز ڈالی ڈالی
ہے اس کا رنگین ہر نظارا
ہمارا اسکول سب سے پیارا

ہم اس کو جنت نشاں کریں گے
ہم اس کی خوشیوں پہ مرمٹیں گے
ہے مقصد علم و فن ہمارا
ہمارا اسکول سب سے پیارا

دعا ہے رب سے صبا نویدی
ملے فلک کی اسے بلندی
چمکتا اس کا رہے ستارا
ہمارا اسکول سب سے پیارا

Dr Aleem Saba Navedi Chennai-

قسط وار داستان

پانچویں قسط

روبنسن کروسو

مصنف: ڈینئل ڈیفو

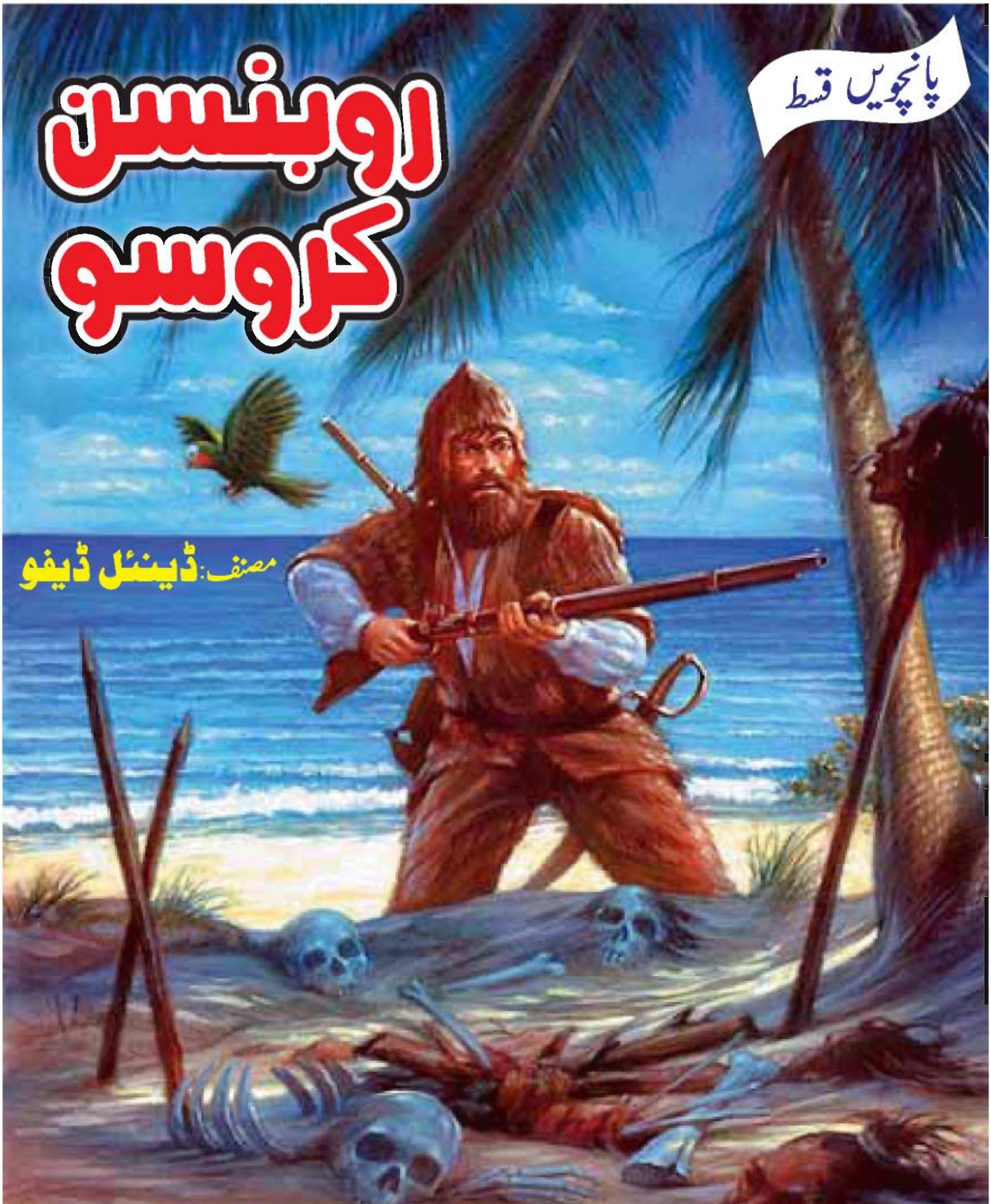

ترجمہ: ایم ندیم

'رابنسن کروسو' انگریزی مصنف ڈینیل ڈیفوDaniel Defoe کا لکھا ہوا مشہور ناول ہے جو سب سے پہلے 25اپریل1719 کو چھپا تھا۔ مصنف کا نام اس میں رابنسن کروسو دیا گیا تھا جب کہ اصل میں یہ ڈیفو کے ناول کا خیالی اور مرکزی کردار کا نام تھا جو اپنی زندگی کے حیرت انگیز واقعات کو سچا بتا کر اپنی داستان سناتا ہے۔ کتاب کا اصل نام کافی طویل تھا مگر یہ 'رابنسن کروسوٗ' کے نام سے ہی مشہور ہوا۔ پڑھنے والوں نے اسے سچی کہانی سمجھا لیکن یہ تمام تر خیالی قصوں کا مجموعہ تھا۔ بنیادی کہانی اسکاٹ لینڈ کے باشندے الیگزینڈر سیلکرکAlexander Selkirk کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی جو 1676 میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے وقت کا مشہور ملاح تھا اور سمندر میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی سے متاثر ہو کر تشکیل دیے گئے کردار رابنسن کروسو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ناول چھپنے کے لگ بھگ ڈھائی سو سال بعد 1966 میں بحرالکاہل کے اُس جزیرے 'ماسا تیرا' کا نام رابنسن کروسو رکھ دیا گیا جہاں سیلکرک چار سال تک رہا تھا۔ کتاب کا مصنف ڈینئیل ڈیفو 1660 میں لندن میں پیدا ہوا اور 24اپریل 1731 کو اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ بیک وقت ایک تاجر، مصنف، صحافی اور جاسوس تھا اور ان مصنفوں میں شامل ہے جنھوں نے انگریزی میں ناولوں کی شروعات کی تھی۔ بہت سے انگریز عالم 'رابنسن کروسوٗ' کو انگریزی زبان کا پہلا ناول مانتے ہیں۔ ڈیفو بڑا ہی زود نویس تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں، ناول، رسالے، کتابچے وغیرہ لکھے جن کی تعداد 500 سے زیادہ ہے اور جرائم، نفسیات، سیاست، مذہب، جنتر منتر اور شادی بیاہ اس کے موضوعات میں شامل ہیں۔ ناول 'رابنسن کروسوٗ' اس کی سب سے مشہور تصنیف ثابت ہوا جس پر کئی فلمیں بن چکی ہیں، دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور بے شمار کامکس اسٹرپ بنائے جا چکے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے پہلی بار 1978 میں اس کی تلخیص اردو میں شائع کی جس کا ترجمہ جناب ایم ندیم نے کیا تھا۔ آیئے اس داستان کی پانچویں قسط پڑھتے ہیں۔ اعزازی مدیر

اب تک آپ نے پڑھا: رابنسن کروسو اپنی کہانی سناتا ہے کہ وہ انگلینڈ کے یارک شہر میں 1632کو ایک دولت مند تاجر کے گھر میں پیدا ہوا۔ سب سے چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے باپ کا بڑا لاڈ پیار ملا۔ رابنسن بڑے ہو کر دنیا کی سیر کرنا چاھتا تھا لیکن والد کو یہ منظور نہ تھا۔ انہوں نے اسے اعلیٰ تعلیم دلائی مگر دنیا بھر میں گھومنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بلوجود ایک دن وہ بچپن کے ایک دوست کے ساتھ دنیا کے سفر پر نکل پڑا جو اپنے والد کے ساتھ سمندری جہاز سے لندن جا رہا تھا۔ لیکن یکم ستمبر 1651کو سفر کے پہلے ہی دن سے منحوس واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاز روانہ ہوتے ہی سمندری طوفان آگیا اور رابنسن اپنی زندگی سے مایوس ہو کر پچھتانے لگا کہ والدین کا کہنا نہ مان کر اس نے سخت غلطی کی ہے۔ یہ طوفان گزر گیا لیکن راستے میں پھر ایک طوفان آیا جس میں ان کا جہاز ڈوب گیا۔ وہ اور جہاز کے لوگ جان بچا کر مشکل سے یارمتھ شہر کے ساحل پر پہنچے۔ اس کے دوست کے والد نے کہا کہ یہ سب رابنسن کی نحوست سے ہو رہا ہے جو اپنے بیمار باپ کی اجازت لیے بغیر اس سفر پر آیا ہے۔ رابنسن یہ سننے کے بعد واپس گھر چلے جانا چاھتا تھا لیکن اسے باپ کا سامنا کرتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ آخر وہ لندن پہنچا جہاں ایک سمندری تاجر اس کا دوست بن گیا۔ والد نے کچھ رقم رابنسن کے پاس لندن بھجوادی تھی جس سے اس نے سمندری سفر کا سامان خرید لیا۔ تاجر دوست کے ساتھ وہ گنی کے سفر پر گیا اور خوب منافع کے ساتھ بہت سا سونا جمع کر کے لندن واپس آیا۔ لیکن یہاں اس کا دوست بیمار ہو کر مر گیا۔ اس نے منافع کا بہت سا حصہ دوست کی بیوہ کے پاس رکھا اور گنی کے ایک اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

اس بار وہ اور اس کے ساتھی جہازی لٹیروں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ایک لٹیرے نے رابنسن کو اپنا غلام بنا لیا۔ مگر کچھ دن بعد رابنس شکار کے بہانے اس لٹیرے کے چنگل سے بچ نکلا۔ سمندر میں ایک جہاز کے نیک دل کپتان نے اس کی مدد کی اور وہ تجارتی سفر پر اسے اپنے ساتھ برازیل لے گیا۔ وہ چار سال برازیل رہا۔ وہاں وہ ایک شوگر فیکٹری بھی کھولنا چاھتا تھا۔ اس کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت تھی اس لیے لندن سے اپنے مرحوم تاجر دوست کی بیوہ سے اس نے اپنی جمع شدہ رقم میں سے ایک ہزار پونڈ کے عوض بہت سا سامان منگوا لیا۔اس نے گنّے اور تمباکو کی کھیتی کے گر بھی سیکھ لیے۔مگر اب وہ بے حد دولت مند بننے کے لالچ میں پڑگیا جس کا اسے بے حد نقصان اٹھا نا پڑا۔ ایک روز تین تاجروں نے آکر اسے لوگوں کو غلام بنا کر بیچنے کا دھندا کرنے کی صلاح دی اور کہا کہ گنی سے بہت سے غلام مل سکتے ھیں جنھیں بیچ کر خوب دولت کمائی جاسکتی ھے۔ وہ ان کی باتوں میں آگیا اور نیک دل کپتان دوست کو لے کر سمندری سفر پر نکل پڑا۔ اس بار بھی سفر کی تاریخ یکم ستمبر تھی اور سال 1659 کا تھاجس سے آٹھ سال پہلے وہ زندگی کے پہلے سمندری سفر پر نکلا تھا۔ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دوھرایا اور کیریبیائی ملکوں کے درمیان طوفان سے ان کے جہاز کو کافی نقصان پہنچا۔ ایک دن ان کا جہاز ریت میں دھنس گیا اور جان بچانے والی کشتی بھی الٹ گئی۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں نے رابنسن کو ساحل پر لا پٹکا۔یہ ایک ویران جزیرے کا ساحل تھا۔رابنسن کی جان تو بچ گئی مگر جہاز تباہ ہو گیا تھاجو سمندر میں ایک چٹان کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ وہ کسی طرح جہاز پر پہنچا ۔ مگروھاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے سبھی ساتھی مر چکے تھے۔ جہاز سے وہ بہت سا کھانے پینے کا سامان گولہ بارود سونا چاندی نقدی اور دوسری بہت سی چیزیں ساحل پر لے آیا۔ چند روز بعد اس نے دیکھا تو جہاز غائب تھا۔ سمندری ہوا اسے بہا کر لے گئی تھی۔ کروسو جزیرے پر اکیلا رہ گیا۔ بس ایک کتا اور دو بلّیاں اس کے ساتھ تھیں جو وہ جہاز سے لایا تھا۔ اس نے بڑی محنت سے جزیرے پر اپنا گھر بنایا۔ میز کرسی تیار کیں۔ جہاز سے مرغیوں کا جو دانہ ساتھ لایا تھا اس دانے سے فصل اگانے کی کوشش شروع کردی۔ اب اسے جزیرے پر دس مہینے ھو گئے تھے۔ ایک دن وہ پورے جزیرے کی سیر کے لیے نکل پڑا۔ ایک جگہ پہاڑی پر اسے خوب پھل اور میوے ملے۔ جزیرے پرسال بھر اکیلے رھنے بعد اس نے وھاں کھیتی کرنے کی ٹھانی۔ پہلے کچھ خاص کامیابی نہیں ملی لیکن اگلی فصل کے بعد کھیتی پھلنے پھولنے لگی۔ اس نے دھان اور جو اگائے۔ تب اسے برتنوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے تیز آگ پر مٹی کے برتن بنائے۔ غلہ رکھنے کے لیے غلے کی کوٹھیاں تیار کیں۔جزیرے پر پانچ سال گزرنے کے بعد ایک چھوٹی کشتی تیار کی جسے ڈونگی کہتے ھیں۔اس نے ڈونگی میں سوار ھو کر جزیرے سے کہیں دور جانے کی کوشش کی لیکن سمندر کی اونچی لہروں اور بھنور نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا اور وہ کسی طرح جان بچا کر واپس آگیا ۔ اس نے دوبارہ سمندر میں جانے کا خیال چھوڑ دیا۔کروسو کواب جزیرے پر گیارہ سال ھو گئے تھے۔گولہ بارود ختم ھونے لگا تھا۔ اس نے شکار کر نے کی بجائے بکریاں پالنا شروع کردیا ۔ ایک دن اسے جزیرے پر انسانی پاؤں کے نشان نظر آئے۔وہ ڈر گیااور سوچنے لگا کہ کوئی بھی چپکے سے آکر اسے مار سکتا ھے۔پھر ایک دن اسے جلی ھوئی انسانی ھڈیا ں ملیں جنھیں دیکھ کر یقین ھوگیا کہ آس پاس کسی جزیرے پر کوئی آدم خور قبیلہ رھتا ھے اور اس کے جزیرے پر آکر انسانوں کو کھایا کرتا ھے۔اس نے ایک محفوظ غار میں رھنا شروع کردیا۔ایک بار اس نے دور سے کچھ ننگ دھڑنگ لوگوں کو کشتیوں سے آتے دیکھا۔ یہ آدم خور قبائلی تھے۔ انھوں نے ایک جگہ آگ کا الاؤ جلایا اور ایک قیدی کو مار کر اس کا گوشت آگ پر بھوننے اور کھانے لگے۔ کروسو کو بڑی گھن آئی اور اس نے اگلی بار ان پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ ایک دن کوئی جہاز جزیرے کے قریب آکر تباہ ھو گیا۔کروسو جہاز پر پہنچا تواس پر سوائے ایک کتے کے کوئی زندہ نہیں ملا۔ اب آگے پڑھیے:

میں نے جہاز میں چاروں طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی زندہ انسان نہ تھا۔ باورچی خانے میں دو آدمی ایک دوسرے سے لپٹے، مرے پڑے تھے۔ جہاز چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تھا اور اس کے اندر سمندر کا پانی بھر گیا تھا جس کی وجہ سے سارا سامان خراب ہو گیا تھا۔ مجھے دو صندوق اور ایک شراب کا پیپا اچھی حالت میں ملے، وہ میں نے اپنی ڈونگی میں رکھ لیے۔ بچے ہوئے سامان میں سے کفگیر، چمٹا، دو پیتل کے تسلے، ایک تانبے کا برتن اور ایک صراحی بھی رکھ لی اور کتے کو ساتھ لے کر بڑی مشکل سے شام تک کنارے پر پہنچ سکا۔

صندوق میں سے بہت ساری کام کی چیزیں نکلیں۔ پہننے کے کپڑے، رومال، آدھ سیر کے قریب سونا، روپیوں کی تھیلی، اس کے علاوہ ایک خوب صورت سی صندوقچی، تین شراب کی بوتلیں، جن کے منہ اچھی طرح سے بند تھے۔ دوسرے صندوق میں تھوڑا سا بارود اور کچھ سونا چاندی اور نقدی تھی، یہ سونا اور چاندی وغیرہ میرے لیے بالکل بے کار تھے۔ بلکہ میری نظر میں تو اینٹ اور پتھر کے برابر تھے۔ اس وقت ایک جوڑی جوتا یا موزے سونے اور چاندی سے کہیں زیادہ قیمتی تھے، کیوں کہ سونے اور چاندی یا روپیوں سے میری کوئی بھی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ چیزیں میں نے پچھلی نقدی کے ساتھ غار میں ایک جگہ رکھ دیں۔

چونکہ مجھے جوتوں کی سخت ضرورت تھی اس لیے میں نے دونوں مرے ہوئے آدمیوں کے جوتے اتار لیے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس جہاز پر بہت ساری قیمتی چیزیں لدی ہوئی تھیں اگر اس میں پانی نہ بھرتا تو بہت ساری کام کی چیزیں مجھے ملتیں۔

آدم خوروں سے لڑائی اور جمن کی رہائی

اس ٹاپو میں میری قید تنہائی کا وہ چوبیسواں سال تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ صبح کا وقت ہے، میں اپنے غار سے نکل کر باہر گیا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سمندر کے کنارے دو ڈونگے کھڑے ہیں ان میں گیارہ آدم خور ہیں۔ وہ ایک آدمی کو پکڑ کر اس کا گوشت کھانے آئے ہیں۔ لیکن وہ آدمی کسی طرح سے ان آدم خوروں کے پنجے سے بھاگ نکلتا ہے اور میرے غار کے قریب ایک پیڑ کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آدم خور اسے تلاش کرتے ہیں لیکن وہ ہاتھ نہیں آتا۔ میں اس کے پاس جاتا ہوں اور اسے بہت تسلی دیتا ہوں۔ وہ عاجزی سے اپنا سر میرے پیروں پر رکھ دیتا ہے۔ میں اسے اپنے گھر لے آتا ہوں اور وہ میرا غلام بن جاتا ہے۔ جب ایک اور ساتھی مجھے مل جاتا ہے تو ہم دونوں اس ٹاپو سے نکلنے کی ترکیبیں کرتے ہیں۔

اسی وقت میری آنکھ کھل جاتی ہے اور یہ جان کر کہ یہ سب خواب تھا مجھے بہت رنج ہوتا ہے لیکن اس خواب سے مجھے یہ تسلی ہوئی کہ اگر میں آدم خوروں کے پنجے سے کسی کو بچا لوں تو میں اس ٹاپو سے نکل سکتا ہوں۔ تب میں نے یہ فیصلہ کیا کہ چاہے جو بھی ہو میں آدم خوروں سے ضرور لڑوں گا۔ چنانچہ میں روزانہ ہتھیار لگا کر اور لڑنے کے لیے تیار ہو کر ٹاپو کے مختلف حصوں میں جہاں جہاں آدم خور آ کر دعوت کھاتے

تھے ، جایا کرتا تھا۔لیکن مجھے ہر روز ناامیدی ہوتی تھی۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔

آخر ڈیڑھ سال کے بعد وہ دن آ ہی گیا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ جدھر میرا غار ہے اسی طرف سمندر کے کنارے پانچ ڈونگوں میں آدم خور آکر ٹھہرے۔ وہ تعداد میں بیس اور تیس کے قریب تھے۔ میں پہاڑ پر دوربین سے ان کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔

آگ کا بڑا سا الاؤ جلایا گیا۔ وہ سب الاؤ کے اردگرد خوب ناچ کود رہے تھے۔ پھر دو آدمیوں کو ڈونگوں پر سے اتار کر لائے۔ ایک وحشی نے ایک آدمی کا سر تلوار سے اڑا دیا اور دوسرے وحشیوں نے اسے چیرنے پھاڑنے کا کام شروع کر دیا اور کھانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ دوسرے قیدیوں کی طرف سے وہ ذرا غافل ہوئے تھے کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا اور دوڑتا ہوا ان سے دور ہو گیا۔ اتنے میں اس کے دشمنوں کو اس کے بھاگ جانے کا پتہ چلا اور تین آدم خور اسے پکڑنے کو بھاگے۔

یہاں تک میرے خواب کی بات پوری ہو چکی تھی۔ مجھے امید تھی کہ دشمن اسے پکڑ نہیں سکیں گے، کیوں کہ بھاگا ہوا قیدی بہت ہی تیز رفتار تھا کیونکہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ میرے غار اور وحشیوں کے دعوت کھانے کی جگہ کے بیچ ایک پانی کا نالہ بھی پڑتا تھا۔ اسی نالے کے ذریعے میں نے اپنے ٹوٹے ہوئے جہاز کا سامان کنارے تک پہنچایا تھا۔ بھاگتا ہوا قیدی اسی نالے میں کودا اور چند لمحوں ہی میں تیر کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ پیچھا کرنے والوں میں سے ایک تیرنا نہیں جانتا تھا اس لیے وہ واپس چلا گیا۔ دو تیرنا جانتے تھے اس لیے وہ بھی نالے میں کود گئے۔

میں اس وقت بھری ہوئی بندوقیں لے کر پہاڑی پر سے اترا اور دوسرے قریبی راستہ سے ہوکر بھاگے ہوئے قیدی کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے زور سے پکارا۔ وہ بے چارہ میری خوفناک صورت دیکھ کر سہم گیا اور جہاں تھا وہیں کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنا دشمن سمجھا۔ میں نے اسے ہاتھ ہلا کر قریب بلایا اور اشاروں سے اسے بتایا کہ میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔

اسی وقت اس کا پیچھا کرتے ہوئے دونوں آدم خور بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے ایک کے سر پر بندوق کا کندہ مارا وہ وہیں زمین پر گر پڑا۔ میں اسوقت بندوق نہیں چلانا چاہتا تھا لیکن جب دوسرے آدم خور نے مجھ پر اپنی کمان سے تیر چھوڑنا چاہا تو میں نے مجبوراً بندوق داغ دی۔ بندوق کی آواز، دھواں اور شعلہ دیکھ کر اور اس کے ساتھ ہی اپنے دشمن کو زمین پر خون میں لت پت دیکھ کر بھاگا ہوا قیدی خوف کے مارے میرے پیروں پر گر پڑا۔ اور جیسے جان بخشی کے لیے گڑگڑانے لگا۔ اگرچہ اس وحشی کی زبان میری سمجھ میں ذرا بھی نہیں آ رہی تھی لیکن چوبیس سال کے بعد ایک انسان کے منہ سے نکلنے والی

وہ بے معنی آواز سن کر مجھے جو خوشی ہو رہی تھی اس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

میں نے اس کو بہت تسلی دی اور پیٹھ اور سر پر ہاتھ رکھا اور ہر طرح سے اسے اطمینان دلایا کہ میں اس کا دشمن نہیں ہوں بلکہ دوست اور خیر خواہ ہوں۔ اپنے دشمنوں کو زمین پر پڑا ہوا دیکھ کر اب وہ مطمئن سا ہوگیا تھا اور اس یقین سا ہوگیا تھا کہ اس کی جان محفوظ ہے۔ اسی وقت وہ آدم خور جس کو میں نے بندوق کا کندہ مارا تھا اور جو بے ہوش ہوگیا تھا اب ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا اور اپنی تلوار نکال کر بھاگے ہوئے قیدی کو دی، اس نے بہت پھرتی اور صفائی کے ساتھ ایک ہی وار میں اس آدم خور کا سر تن سے جدا کر دیا اور میری تلوار مجھے واپس کر دی۔ ان دونوں آدم خوروں کو ہم نے ریت میں دبا دیا۔

ہم دونوں نے پہاڑی پر چڑھ کر دیکھا کہ آدم خوروں کی ڈونگیاں وہاں نہیں تھیں۔ وہ سب واپس چلے گئے تھے، تب میں اس وحشی کو لے کر اس جگہ گیا جہاں آدم خوروں نے دعوت کھائی تھی۔ وہاں خون اور بہت سارے انسانی جسم کے حصے پڑے ہوئے تھے وہ چار قیدیوں کو پکڑ کر لائے تھے۔

جس دن یہ واقعہ پیش آیا وہ جمعہ کا دن تھا اس لیے میں نے اس وحشی کا نام جمن رکھ دیا تھا، جمن پچیس یا چھبیس سال کا لمبے قد اور

چھریرے بدن والا تندرست جوان تھا۔ اس کا رنگ بہت سیاہ نہیں تھا۔ وہ بہت سادے دل کا انسان تھا اور باوجود وحشی ہونے کے اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ وہ میری اطاعت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا اور ہر وقت میرا حکم بجالانے کا تیار رہتا تھا۔ وہ میری بہت عزت کرتا تھا، مجھے اس سے بہت مدد ملتی تھی میں خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اس نے میری مدد کے لیے جمن کو بھیج دیا۔

میں نے جمن کو پہننے کے لیے ملاح کا پاجامہ، بکری کے کھال کی صدری اور خرگوش کے کھال کی ٹوپی دی۔ وہ یہ لباس پہن کر بہت خوش ہوا۔ شروع شروع میں اسے کپڑے پہن کر چلنے میں تکلیف ہوئی تھی کیوں کہ وہ کپڑے پہننے کا عادی نہیں تھا لیکن دھیرے دھیرے اسے کپڑوں کی عادت ہوگئی۔

میں نے جمن کو اپنے مکان میں دو دیواروں کے بیچ میں خیمہ بنا کر رہنے کے لیے جگہ دی۔ دروازہ میں کواڑ جڑ دیے تھے اور اس میں تالا لگا دیا تھا۔ میں نے یہ کام احتیاط کے طور کیا تھا کہ جمن کبھی بھی سوتے میں مجھے نقصان نہ پہنچا سکے۔ مجھے ابھی اس پر پورے طور پر بھروسہ نہیں تھا۔ تمام ہتھیار میں حفاظت کے ساتھ اندر رکھ کر سویا کرتا تھا۔ ویسے جمن بہت ایماندار اور بھروسہ کے قابل تھا۔

دھیرے دھیرے جمن مجھ سے بہت مانوس ہوگیا۔ میں اس کو اپنی زبان سکھلانے لگا اور چیزوں کے نام بتانے لگا۔ یہاں تک کہ ہم

ایک دوسرے کی بات اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں سمجھنے لگے۔ میرے لیے یہ بات بہت ہی خوشی اور تسکین کا باعث تھی۔

چونکہ جمن بھی آدم خور تھا اور انسانی گوشت کھانے کی اس کی عادت تھی، اس لیے میں نے اسے انسانی گوشت نہ کھانے کی خوب تلقین کر دی تھی۔ اور اسے بکری کا گوشت کھلاتا تھا۔

جمن بندوق سے بہت ڈرتا تھا اور ایک طرح سے اس کی پوجا کیا کرتا تھا تا کہ وہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ میں نے اس کے سامنے بندوق میں چھرّا بارود بھرا اور چلا کر دکھایا کہ اس میں سے شعلہ نکلنے اور دشمن کے مرجانے کا کیا بھید ہے۔ اس پر بھی وہ بہت دنوں تک بندوق سے ڈرتا ہی رہا۔

میں نے اس کو دھان کوٹنا، روٹی پکانا، خوب سکھلایا۔ جمن بہت سمجھ دار تھا۔ رفتہ رفتہ سارے کام میری مرضی کے مطابق کرنے لگا۔ ہم دونوں نے مل کر زیادہ غلہ اگانے کے لیے اور زمین تیار کی۔ جیسی خوشی اور اطمینان مجھے اس سال نصیب ہوا ویسی خوشی میں نے پچھلے چوبیس سال میں بھی محسوس نہیں کی تھی۔

دھیرے دھیرے جمن میری زبان مختلف چیزوں اور جگہوں کے نام بخوبی سیکھ گیا۔ یہاں تک کہ وہ مجھ سے ہر طرح بات چیت کرنے لگا۔ میں نے اپنا کل حال اسے بتایا کہ میں کیا تھا اور یہاں اس ٹاپو میں کس طرح آیا، اور یہ تمام چیزیں کس طرح اکٹھا کیں۔ وہ میری داستان سن کر بہت متاثر ہوا اور میرا اور بھی گہرا دوست بن گیا۔

اس نے اپنے قبیلہ کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائیں اور دوسرے آدم خود قبیلوں کے بارے میں بتایا کہ کس طرح یہ آدم خور لڑائی میں پکڑے ہوئے قیدیوں کو مار مار کر کھا جاتے ہیں۔

میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس کے جزیرے تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اگر ایک بڑی مضبوط کشتی تیار ہو جائے تو وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔

اب جمن بندوق چلانا سیکھ گیا تھا اور اب وہ بندوق سے ڈرتا بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے ایک چھری دی اور اس کی کمر میں چمڑے کی پیٹی باندھ دی جس میں ایک طرف کلہاڑی لٹکی رہتی تھی، ایک دن میں اسے اپنے ملک کا حال بتا رہا تھا کہ وہاں لوگ کس طرح رہتے ہیں۔ خدا کی عبادت کرتے ہیں اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، اور قریب کے ملکوں سے جہازوں کے ذریعہ تجارت کرتے ہیں۔ چونکہ جمن نے اب تک جہاز نہیں دیکھا تھا، اس لیے میں نے اس کو وہ کشتی دکھلائی جو اب تک ریت میں دبی ہوئی اور اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ کشتی دیکھ کر جمن بولا ایسی کئی کشتیاں اس نے اپنے ملک میں بھی دیکھی ہیں۔ اس بات سے میں نے نتیجہ نکالا کہ طوفان کی وجہ سے جہازوں کی کشتیاں بہہ کر ادھر پہنچ گئی ہوں گی۔

ایک دن اس نے بتایا کہ ولایتی لوگ اس کے ملک میں چار سال سے رہ رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح ہیں اور اس کے قبیلہ کے آدم خوروں نے ان کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ گو اس کے قبیلہ کے لوگ بھی آدم خور ہیں وہ صرف ان ہی لوگوں کو مار کر کھاتے ہیں جو لڑائی میں ہاتھ آتے ہیں۔ جب میں نے ان لوگوں کی شکل وصورت کے بارے میں پوچھا تو جمن نے جو بیان کیا اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ لوگ اسپینی ہوں گے یا پرتگیزی۔ تب میں نے سوچا کہ اگر میں ان کے پاس پہنچ جاؤں تو ممکن ہے ان کی مدد سے اپنے ملک تک پہنچنے کا کوئی راستہ نکل آئے۔ اب میں جمن کے جزیرے تک پہنچنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جمن کے قبیلہ والوں کو انسانیت کی تعلیم دوں اور انھیں آدم خوری سے باز رکھوں۔ جمن نے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ اس کے قبیلہ کے لوگ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور اس کی جان بچانے کے بدلے میں احسان مند ہوں گے اور ہر طرح کی مدد کریں گے۔

ہم دونوں نے مل کر خوب محنت کر کے ایک بڑے سے درخت کو کاٹا، اور ایک ماہ کی مدت میں ناؤ تیار کی۔ گو اس کو پانی تک پہنچانے میں ہمیں دو ہفتے لگے۔ اس ناؤ میں بیس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، جمن اس ناؤ کو بڑی مہارت کے ساتھ چلا لیتا تھا۔ ناؤ میں پال اور مستول لگانے میں دو مہینے اور گزر گئے۔ میں نے جمن کو کشتی چلانے کا فن اچھی طرح سکھلایا اور بتایا کہ پال کس طرح لگاتے اور اتارتے ہیں۔ جمن نے اب تک پال والی کشتیاں نہیں دیکھی تھیں۔ اس کے ملک میں ڈونگیوں کا رواج تھا۔ جمن بہت ذہین تھا۔ اس لیے بہت جلد وہ ایک اچھا ملاح بن گیا۔ میں نے سفر کا سارا سامان تیار کر لیا تھا۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ جمن بھی بہت خوش خوش تھا کہ تین سال کے بعد وہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں سے ملاقات کرنے کے لیے جا رہا تھا۔

ایک دن میں نے جمن کو سمندر کے کنارے کچھوے پکڑنے بھیجا۔ کبھی کبھی وہ کچھوے پکڑ کر لاتا تھا اور اس کا گوشت اور انڈے

بڑے شوق سے کھاتا تھا۔

جمن ہانپتا کانپتا واپس آیا اور بولا کہ تین ڈونگے کنارے پر آ کر رکے ہیں اور آدم خور شاید اس کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ ڈر کر مارے کانپ رہا تھا۔

میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جو حشر میرا ہوگا وہی اس کا ہوگا۔ اس وقت بہتر ہے کہ ہم ان موذیوں سے دو دو ہاتھ کرلیں، میں نے پرندے مارنے والی دو بندوقیں جمن کو دیں اور اس میں چھرّا بارود بھرا۔ چار بندوقیں میں نے لیں۔ اس کے علاوہ دو پستولوں میں بھی گولیاں بھر کر اپنی کمر سے باندھیں اور دو پستول جمن کو دیے۔ میں نے پہاڑی پر چڑھ کر دیکھا تو اکیس آدم خور اور ان کے تین قیدی تھے۔ تب میں نے نتیجہ نکالا کہ ان کا ارادہ ان قیدیوں کو مار کر کھانے اور چلے جانے کا ہے۔ مجھے ان موذیوں پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے ان کو سبق سکھلانا ضروری سمجھا تا کہ آئندہ وہ ادھر آنے کی ہمت نہ کرسکیں۔

میں نے ایک بوتل شراب اور بارود کی تھیلی جمن کو دی اور اسے خوب اچھی طرح سمجھا دیا کہ جب میں اشارہ کروں تب حملہ کرے، اور جیسا میں کہوں اس پر عمل کرے۔ ہم لوگ نالے کو پار کر کے، آدم خوروں کے اتنے قریب تک پہنچ کر رک گئے جہاں سے ان پر آسانی سے حملہ کیا جا سکے، اور ایک پیڑ کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گئے اور ان کی حرکتیں دیکھنے لگے۔

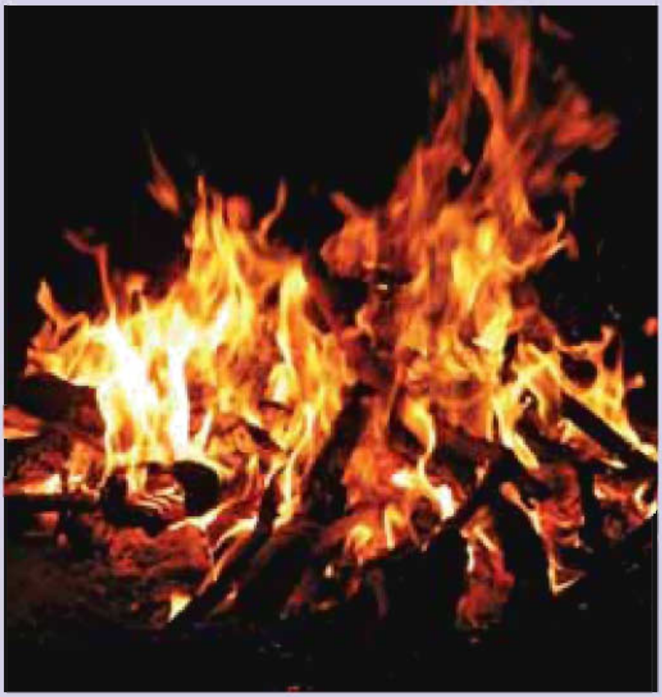

وحشی آگ کے الاؤ کے اردگرد بیٹھے تھے اور ایک قیدی کو چیر پھاڑ کر کھانے میں مشغول تھے۔ دوسرا قیدی ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر درخت کی چھال سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا رنگ گورا تھا اور وہ کوئی انگریز معلوم ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر غصہ کے مارے میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے جمن سے کہا کہ بس اب وہ تیار ہوجائے ہم دونوں نے ایک ساتھ ان آدم خوروں پر بندوقیں چھوڑیں، جمن نے دو کو جان سے مارا، اور تین کو زخمی کیا اور میں نے ایک کو مارا اور دو کو گھائل کیا۔ وحشی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے یہ کیا ماجرا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس چیز نے ان کے ساتھیوں کو اتنی دور سے مار ڈالا۔

میں نے اور جمن نے دوبارہ ان پر حملہ کیا اور کئی کو زخمی کر دیا۔ وحشی خوف اور دہشت کے مارے چلاتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس وقت ہم دونوں باہر نکلے۔ ہماری صورت دیکھتے ہی وہ شور مچا کر بھاگے۔ وہ وحشی جو اس گورے آدمی کے ہاتھ پیر کھول رہے تھے، وہ بھی ڈر کر بھاگے اور جمن کی گولی سے زخمی ہو کر ڈونگی میں جا پڑے۔

میں نے اس گوری چمڑی والے کے ہاتھ پیر کھولے۔ اسے بوتل سے نکال کر شراب کے چند گھونٹ پلائے اور تھوڑی سی روٹی کھلائی، تو اس کی ذرا جان میں جان آئی اور وہ بولا:

''میں اسپینی ہوں۔''

میں نے اسے تسلی دی اور کہا ''یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں ہے، اگر تم میں طاقت اور ہمت ہے تو بندوق اور پستول سنبھالو۔'' اس نے

خوشی سے ہتھیار لیے اور بڑی پھرتی کے ساتھ اٹھ کر دشمنوں پر جا پڑا اور اس نے بھی دو آدم خوروں کو جان سے مار ڈالا۔

میں نے اور جمن نے اپنی اپنی خالی بندوقوں کو بھرا۔ جمن نے اس وقت بڑی ہی بہادری کا ثبوت دیا۔ اس نے کلہاڑی لے کر بھاگتے ہوئے آدم خوروں کا پیچھا کیا اور تین زخمیوں کو اور مار ڈالا۔ البتہ تین چار وحشی ایک ڈونگی میں بیٹھ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان میں سے دو بہت سخت زخمی تھے۔

جمن کا کہنا تھا کہ ہم کشتی میں بیٹھ کر ان کا ضرور پیچھا کریں اور ختم کر ڈالیں، کیونکہ اگر یہ بچ نکلے تو ہوسکتا ہے کہ اپنے قبیلہ کے دوسرے آدم خوروں کو لا کر ہم پر کسی وقت بھی حملہ کر دیں۔ میں نے بھی سوچا کہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن جب ہم ان کا پیچھا کرنے کی نیت سے ایک ڈونگی پر بیٹھے تو دیکھا کہ اس ڈونگے میں ایک اور قیدی جکڑا پڑا ہے اور ادھ مرا سا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول دیے اور اسے اشاروں سے سمجھایا کہ اب وہ دشمنوں کے پنجے سے بچ گیا ہے۔

ہم نے اس قیدی کو تھوڑی سی شراب پلائی اور کچھ روٹی کھلائی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جمن نے جب اس کی صورت اچھی طرح سے دیکھی تو مارے خوشی کے اچھلنے کودنے اور قہقہے لگانے لگا۔ وہ کبھی قیدی کے منہ کو دیکھتا اور کبھی قیدی کے سر کو چومتا تھا۔ میں جمن کی اس حرکت کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ نہ جانے اسے کیا ہوگیا ہے۔ جو ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چپ ہوا اور بولا:

''صاحب! آپ کی مہربانی سے میرا باپ موت کے منہ سے بچ گیا ہے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔''

مجھے بھی یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ بوڑھا آدمی جمن کا باپ تھا۔

ہم دشمنوں کے ڈونگے کا پیچھا نہیں کر سکے کیوں کہ اتنی دیر میں وہ بہت دور نکل چکے تھے۔ لیکن یہ ہمارے لیے اچھا ہی ہوا کیوں کہ دو گھنٹے کے بعد سخت طوفان آیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آدم خور اپنے گھر صحیح سلامت نہیں پہنچ سکے ہوں گے اور طوفان کی نذر ہوگئے ہوں گے۔

جمن اپنے باپ کی خدمت میں لگا رہا اور اسے روٹی پانی دیتا رہا۔ اس نے اس کے ہاتھ پیروں کی خوب مالش کی جو بہت دیر تک بندھے رہنے کی وجہ سے اکڑ گئے تھے۔ جمن نے اور میں نے اس اسپینی کے ہاتھوں اور پیروں کی بھی مالش کی۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ سب اللہ کی مہربانی ہے جو اس نے رہائی کی تدبیر کی اور مجھے وسیلہ بنایا۔ میں نے اور جمن نے ہاتھوں ہاتھ ان دونوں کو اپنے پہاڑ والے مکان تک پہنچایا کیوں کہ وہ دونوں اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ دو قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ ہم نے ان کے لیے ایک خیمہ لگا کر باہر رہنے کا انتظام کر دیا۔ **جاری**

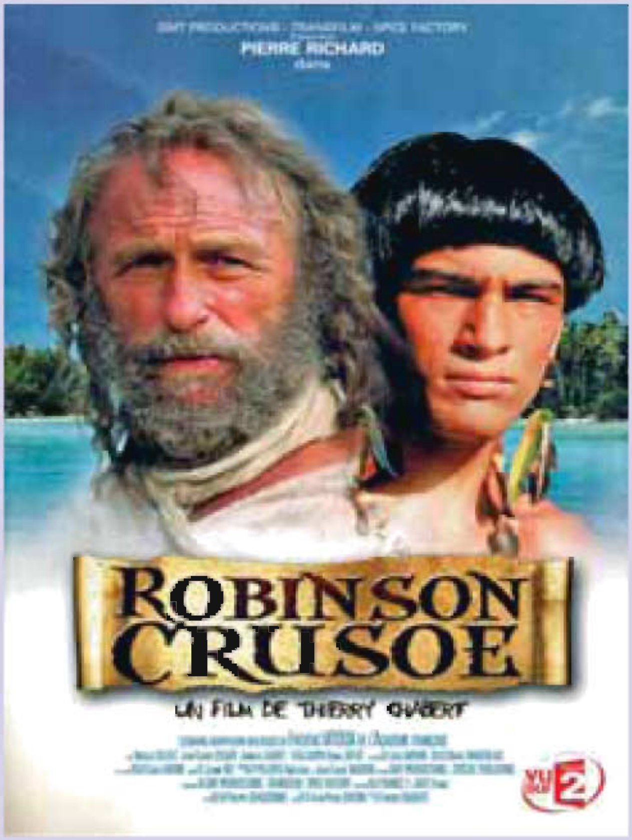

رابنسن کروسو پر بنائی گئی ایک اور فلم کا پوسٹر

ادارہ

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

• کسی دشمن کے 100 لفظ تکلیف نہیں دے سکتے۔
لیکن ایک دوست کی خاموشی 100 آنسو دے سکتی ہے۔
اس لیے بک بک کرتے رہا کرو۔ تسلّی رہتی ہے۔

• سردی میں رات تین بجے اگر پانی میں برف ڈال کر نہا لیا جائے تو
رنگ صاف اور گورا ہو جائے گا
اور پھر سب کہیں گے
کتنا نورانی چہرہ ہے
مرحوم کا!

• کسی کے غم کی وجہ مت بنو
اس کے غم کا حصہ بنو
لیکن
کس کی خوشی کا حصہ مت بنو
اس کی وجہ بنو!
مسکراتے رہو

• کبھی کبھی دل چاہتا ہے کچھ ایسا ہو جائے
پیپر ہوں لیکن رزلٹ نہ آئے
کلاس ہو پر ٹیچر نہ آئے
بس میں بیٹھیں پر اسکول نہ جائیں
پک نک جائیں اور واپس نہ آئیں
ہفتے میں 3 دن ہوں اور پھر سنڈے آئے
سوتے رہیں دن بھر شام کو گھومنے جائیں
سب دوست ساتھ رہیں اور چھٹیاں منائیں
بارش میں بھیگیں اور زور سے گائیں
دنیا کو بھول کر پھر بچے بن جائیں
بھیڑ سے دور ایک دنیا بنائیں
ساری زندگی بس یوں ہی کٹ جائے
کبھی کبھی دل چاہتا ہے کچھ ایسا ہو جائے

شمائلہ صدف، گوربید نگر، مالیگاؤں

• استاد: بتاؤ سب سے زیادہ نشہ کس چیز میں ہوتا ہے؟
شاگرد: سر! کتابوں میں
استاد: وہ کیسے؟
شاگرد: کتاب کھولتے ہی نیند آنے لگتی ہے...

نام پتہ نہیں دیا

• اگر برائی کو شروع میں ہی نہ روکا جائے تو وہ آہستہ آہستہ ضرورت بن جاتی ہے۔

• زندگی تعلیم کے بغیر کھوکھلی ہے

• وقت ہی پیسہ ہے! Time is money

نور محمد ادریس، رمضان پورہ، مالیگاؤں

• سنتا: ایک مرتبہ ایک چھپکلی گانا گا رہی تھی اور دو چھپکلیاں اس کا گانا سن رہی تھیں۔ گانا ختم ہوتے ہی دونوں چھپکلیاں دیوار سے گر گئیں! بتا کیوں؟

بنتا: کیوں کہ گانا بہت بے سرا تھا۔
سنتا: غلط۔
بنتا: گانا ختم ہوتے ہی وہ دونوں بے ہوش ہو گئیں

سنتا: یہ بھی غلط۔

بنتا: چل، پھر تو ہی بتا۔

سنتا: دراصل گانا سنتے ہی دونوں تالیاں بجانے لگی تھیں!

اسد عمیر امتیاز، مالیگاؤں، ناسک، مہاراشٹر

• 2 پیاز

3 لہسن

50 گرام زیرہ

3 پاؤ مرچ

2 چمچے نمک

1 کپ پانی

اور تھوڑا سا ہرا دھنیا

پتہ ہے ہم کیا بنا رہے ہیں؟

آپ کو بے وقوف

اور وہ بھی مسالہ لگا کے

شانو، نئی دہلی

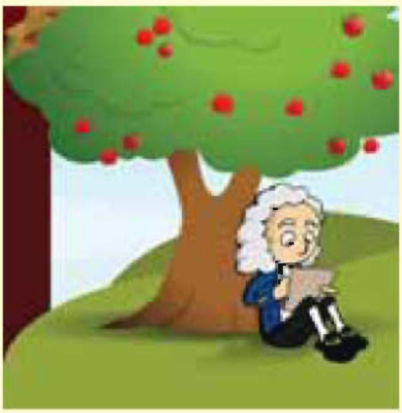

• سوچو فزکس کتنی آسان ہوجاتی اگر ایک سیب گرنے کی کی بجائے پورا درخت ہی نیوٹن کے سر کے اوپر گر گیا ہوتا۔

صائمہ صدف، مالیگاؤں

• ایک 'عامل' کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ روح سے بات کراتا ہے۔ ایک لڑکا اس کے پاس گیا اور کہا کہ میرے دادا کی روح سے میری بات کرا دیجیے۔ اسے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں آواز آئی، ''کہو کیا پوچھنا ہے؟''

لڑکے نے کہا، ''آپ کی روح یہاں کیا کر رہی ہے، جبکہ ابھی آپ کا انتقال بھی نہیں ہوا ہے!''

نبیلہ تنزیل، الہ آباد۔ یوپی

• ایک مولوی صاحب بس میں جا رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر بیٹھی عورت اپنے بچے سے بار بار کہہ رہی تھی کہ بیٹا یہ حلوا کھالے نہیں تو میں اسے مولوی صاحب کو دے دوں گی جو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ مگر بچہ کھا ہی نہیں رہا تھا۔ عورت نے چوتھی بار پھر یہی بات کہی تو مولوی صاحب سے نہ رہا گیا اور وہ تنگ آکر بولے، ''بی بی جلدی سے کوئی فیصلہ کرلو۔ تمھارے حلوے کے چکّر میں میں چار اسٹاپ آگے آگیا ہوں۔''

امیرہ شجر، فاطمہ گرلز اسکول، اورنگ آباد

• بیٹا: پاپا اگر آپ کو پتہ چلے کہ میں امتحان میں فرسٹ کلاس پاس ہوا ہوں تو آپ کو کیسا لگے گا؟

باپ: میں تو خوشی سے پاگل ہوجاؤں گا کہ میرا نکھٹو بیٹا اتنا بڑا کام بھی کرسکتا ہے!

بیٹا: بس اسی ڈر سے میں فیل ہوگیا کہ کہیں آپ پاگل نہ ہوجائیں!

• ٹینا: کیا تم تارے گن سکتی ہو؟

مینا: ہاں، لیکن اس وقت تو رات ہے۔ دن کے اجالے میں گن کر بتاؤں گی!

ایمن الکثیر، ناندیڑ

• ایک ماں جس بچے کو 20 سال میں انسان بناتی ہے، دوسری عورت اسی کو 20 منٹ میں الّو بنا دیتی ہے۔

سعدیہ دانش، اسماعیل پورا، کامٹی

• اپنی راہ خود چنو

دل جو کہے وہی کرو
اپنے پیچھے والوں کو آگے مت
جانے دو
اور جو آگے ہے اس سے آگے نکلو
تبھی ایک اچھے...
رکشا والے بن پاؤ گے!

ثنا رحمین سید، تعلقہ پورنا، ضلع پربھنی

• ایک بار سنتا پر بجلی کا تار گر گیا۔
وہ تڑپ تڑپ کر مرنے ہی والا تھا کہ اسے یاد آیا، دو دن سے بجلی ہی نہیں ہے۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور تار کو کوستے ہوئے بولا، ''کم بخت نے ڈرا ہی دیا تھا!''

بشریٰ سید اعظم، پربھنی

• لوگوں نے ایک بے وقوف سے نظر آنے والے شخص کو دیکھا کہ وہ اجالے میں ایک سڑک پر کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ انھوں نے اس سے پوچھا کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ اس شخص نے کہا، ''میری انگوٹھی گر گئی ہے۔''
لوگوں نے پوچھا کہاں گری تھی؟ اس شخص نے کہا، ''وہاں، دوسری سڑک پر!''
لوگوں نے کہا، جہاں انگوٹھی گری تھی وہاں کیوں نہیں ڈھونڈتے؟
اس شخص نے کہا، ''وہاں اندھیرا ہے۔ اندھیرے میں ڈھونڈنے سے کیا فائدہ؟''

نعیم احمد علیگ، غازی پور

• کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ کیوں، کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے؟

• سنتا: یار یہ سینٹ میسیج Sent Message کیا ہوتا ہے؟
بنتا: تو نے تو یار بے وقوفی کی حد ہی کر دی۔ سینٹ میسیج کا مطلب ہے خوشبو والا میسیج۔

• سنتا: یار اٹھ! لگتا ہے زلزلہ آ گیا ہے۔ پورا مکان ہل رہا ہے!
• بنتا: سوجا سوجا! مکان گرے گا تو مکان مالک کا گرے گا۔ ہم تو کرائے دار ہیں!

محمد صفی اللہ خان، پربھنی

• استاد: کسی دیوی اور دیو کا نام بتاؤ۔
شاگرد: سری دیوی اور کپل دیو

محمد سعد قریشی، مدینہ نگر، پربھنی

• دوست: جب سے میری بیوی کا انتقال ہوا ہے میری آنکھ سے آنسو نہیں نکل رہے ہیں!
دوسرا دوست: کوئی بات نہیں۔ سوچنا شروع کر دو کہ تمھاری بیوی پھر سے زندہ ہو گئی ہے۔ آنسو ضرور نکلیں گے!

محمد کاشف خورشید، مالیگاؤں

• ایک شخص کتّے کے گلے میں بندھے پٹّے کی ڈور کا دوسرا سرا پکڑے کتّے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔
ایک شخص نے یہ دیکھا تو بولا، 'ارے یہ صبح صبح گدھے کو باندھ کر کہاں لے جا رہے ہو؟''
پہلا شخص جھلاّ کر بولا: ''بے وقوف، تمھیں یہ گدھا دکھائی دیتا ہے؟''
دوسرے شخص نے کہا: ''میں تم سے نہیں کتّے سے پوچھ رہا ہوں!''

محمد توحید، مالیگاؤں، مہاراشٹر

• جالنا نام کا ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں راجو نام کا ایک لڑکا اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ راجو کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ روز صبح کو سرکاری اسکول جاتا تھا۔ راجو بہت غریب تھا لیکن اللہ نے اسے دماغ خوب دیا تھا۔ ایک دن راجو اسکول سے گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ راجو اس بارش میں خوب بھیگتا ہوا گھر پہنچا۔ بھیگنے سے اسے زکام ہو گیا اور پھر بخار آ گیا۔ اس کی ماں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ پھر بھی اس کا بخار کم نہیں ہوا۔ تب اس کی ماں اسے دوسرے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ دوسرے ڈاکٹر نے دوائیاں دیں اور

آرام کرنے کو کہا۔ راجو گھر میں آرام کرنے لگا۔ ایک دن راجو کی ماں اس کے کمرے میں پہنچی تو راجو کمرے میں نہیں تھا۔ ماں نے اسے بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا۔ چار گھنٹے بعد راجو گھر آیا اور جیب سے ایک کارڈ نکال کر ماں کو دیتے ہوئے بولا: ’’ہیپی مدرس ڈے!‘‘

قاضی مدثر، بیڑ، مہاراشٹر

• لڑکا: میں چار سال کا ہوں

لڑکی: میں بھی چار سال کی ہوں

لڑکا: تو چلو میرے ساتھ

لڑکی (شرماتے ہوئے): کہاں

لڑکا: پولیو ڈراپس پینے کے لیے!

• دولہا دلہن سے: آج سے تم میرے گھر کی زینت ہو، روشنی ہو، خوشی ہو، مسکان ہو، تمنا ہو...

دولہن: آپ بھی آج سے میرے عمران ہیں، طاہر ہیں، ریحان ہیں، سلطان ہیں، جنید ہیں...

نوشین ارم، جگہ نہیں لکھی

• میاں بیوی راستے میں کہیں جا رہے تھے۔ بیوی کی نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا:

بنارسی ساڑھی 7 روپے

نائلون ساڑھی 8 روپے

سوتی ساڑھی 5 روپے

یہ پڑھتے ہی بیوی بولی، ’’چلو جی چار پانچ ساڑھیاں خرید لیتے ہیں‘‘

میاں نے کہا، ’’غور سے دیکھو یہ ساڑھی کی نہیں کپڑے پریس کرنے کی دکان ہے!‘‘

• اسٹیج پر ایک گلوکار بہت دیر سے لوگوں کو اپنے گانوں سے بور کر رہا تھا۔ تبھی اس نے تیسرا گانا شروع کیا:

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا!

اس پر محفل میں ایک شخص نے کہا: شکر ہے خدا کا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا آپ رات بھر یہیں گاتے رہیں گے۔

سارہ مہین، مہاراشٹر اسکول پربھنی، مہاراشٹر

• سنتا بنتا اور ان کا ایک دوست موٹر سائیکل پر کہیں جا رہے تھے۔ ٹریفک پولیس والے نے تین آدمی ایک موٹر سائیکل پر بیٹھے دیکھ کر انھیں رکنے کا اشارہ کیا۔ اس پر سنتا نے کہا: یار تو بیٹھے گا کہاں؟ بائک پہلے ہی ہاؤس فل ہے!

نور العین مصباح، پتھری پربھنی

• ایک خاتون کلرک نے اپنے افسر سے شکایت کی: جناب میرا ساتھی کلرک مجھے ہر بار جھوٹ بولنے پر اکساتا رہتا ہے!

افسر نے پوچھا: وہ کیسے؟

خاتون: وہ بار بار مجھ سے میری عمر پوچھتا ہے!

غفران الحق، ناندیڑ

• کیا آپ پاگل ہیں؟

غصہ نہ ہوں میرے پاس ثبوت ہے

پ: پیارے ہو

ا: اچھے ہو

گ: گریٹ ہو

ل: لاجواب ہو

اب بولو!

عائشہ کوثر، اورنگ آباد، مہاراشٹر

• سنتا نے فلم 'جنت' دیکھنے کے بعد بنتا سے پوچھا: ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے تو نانی کے قدموں کے نیچے کیا ہونا چاہیے؟

بنتا: پتہ نہیں یار۔

سنتا: سیدھی سی بات ہے۔ نانی کے قدموں کے نیچے 'جنت ٹو' ہوگی!

محمد ابرار احمد، ناندیڑ

• ٹیچر: تم اتنے گندے کیوں رہتے ہو؟ گندگی انسان کی دشمن ہے!

اسٹوڈنٹ: سر آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اپنے دشمن سے بھی پیار کرو!

حرا طفیل، نیوج، اعظم گڑھ، اتر پردیش

ادارہ

اردو Facebook

طہورہ طیب

رِمشہ

میسرہ

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ مریضوں کی دُعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے اس لیے میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ ہر انسان کا کوئی نہ کوئی خواب ضرور ہوتا ہے اور خواب دیکھنے بھی چاہییں لیکن خواب ایسا دیکھنا چاہیے جو پورا ہو اور مجھے یقین ہے کہ میرا یہ خواب انشا اللہ ضرور پورا ہوگا کیونکہ میں بہت محنت کروں گی۔ اور ایک دن ڈاکٹر بن کر دکھاؤں گی۔

سیّدہ واسعہ ضوفین، درجہ سوم، سر سیّد احمد خان اُردو پرائمری اسکول، بیڑ

مہاراشٹر کے اسی اسکول کے درجہ چہارم کی طالبہ عدیفہ فاطمہ لکھتی ہیں: انسانوں کی خدمت کرنا اللہ کی عبادت کے برابر ہے۔ اس لیے میں انسانوں کی رات دن خدمت کرنے کے لیے ایک اچھی ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ اکثر دیہات میں جہاں علاج کی سہولتیں نہیں ہوتیں ایسی جگہوں پر جا کر میں غریبوں اور محتاجوں کا علاج کر کے اُن کی مددگار بننا چاہتی ہوں۔ غریبوں کا علاج کر کے دل کو جو سکون ملے گا وہ کسی اور طرح سے نہیں مل سکتا۔

■ ان حوصلہ مند بچّیوں کے ارادے بہت اچھے ہیں اور ہماری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔ اردو کے اسی اسکول سے چھ اور ذہین طالبات نے اپنی تصویریں اردو فیس بک کے لیے بھیجی ہیں:

فاطمہ

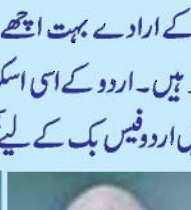

عائشہ تزئین

الفیہ

قلم کاروں سے اہم گزارش

■ 'بچوں کی دنیا' کے لیے کہانیاں، نظمیں اور مضامین رقم کرتے وقت پانچ سے پندرہ سال تک کے بچّوں کی ذہنی و لفظی استعداد، دل چسپی اور نازک و معصوم احساسات کو ضرور ذہن میں رکھیں۔

■ گنجلک اور مرکب جملوں کی بجائے عام فہم اور سیدھے سادے جملوں کے ذریعے بات کو سمجھانے کا اسلوب اپنائیں اور جہاں تک ممکن ہو مشکل الفاظ اور اضافتوں سے گریز کریں۔

■ موضوعات اور تحریروں میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ یہ رسالہ بچوں میں سماجی و تاریخی شعور کے ساتھ سائنسی مزاج Scientific Temper پیدا کرنے کو اولین ترجیح دیتا ہے۔

■ کسی بھی موضوع پر مضمون لکھنے سے پہلے مدیر یا اعزازی مدیر سے مشورہ کر لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

■ اپنی نگارشات کمپوز کر کے ای میل سے بھیجیں تو اچھا ہے۔ بصورت دیگر انھیں صاف اور خوش خط لکھ کر بھیجیں۔ چاہیں تو ڈاک کی بجائے ان نگارشات کی اسکین Scan کی ہوئی نقل ای میل سے بھیجی جاسکتی ہے۔

■ لکھنے کے لیے A4 سائز سے بڑا کاغذ ہرگز استعمال نہ کریں۔

■ ہمیں بھیجی گئی نگارشات کی ایک نقل اپنے پاس بھی ضرور رکھیں۔

■ منظوم نگارشات میں بحر اور وزن کا پورا خیال رکھا جائے۔

ادارہ

1

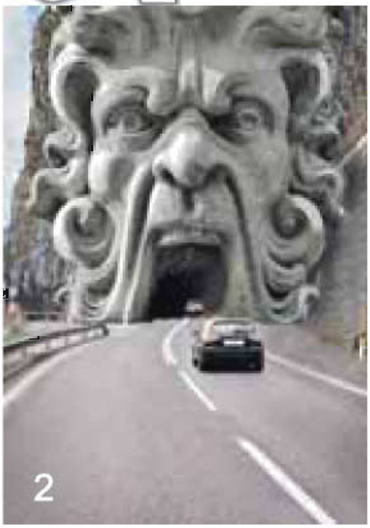

2

انوکھی پہاڑی سڑکیں: 1 ہمالیائی علاقے میں لداخ کی یہ سڑک دنیا کی سب سے اونچی اور خطرناک سڑکوں میں گنی جاتی ہے۔2 پہاڑی سرنگ کے منہ پر ایسا ہولناک دروازہ بنا دیا جائے تو آدمی دن میں بھی ڈر جائے۔ یہ انجینئروں کے فن کی نہیں بلکہ فوٹو شاپ کے ماہروں کی بھیانک کرامات ہے۔3 پہاڑوں کے درمیان لیٹا ہوا دنیا کا سب سے لمبا اجگر نظر آنے والی یہ چیز دراصل ارجنٹائن کے پہاڑوں میں بنائی گئی سڑک ہے جس سے لمبے ٹرک بھی گزر سکتے ہیں۔4 یہ ہے انگلینڈ میں بڑے سلیقے سے بنائی گئی پہاڑی سڑک

3

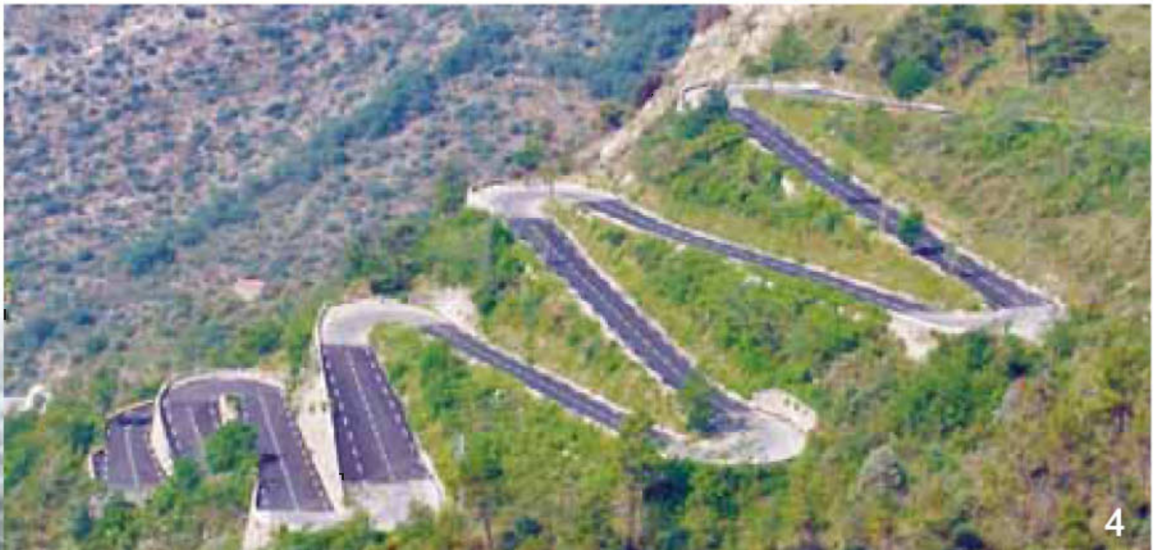

4

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

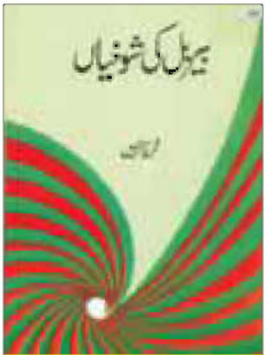

صفحات: 64، قیمت: 12 روپے

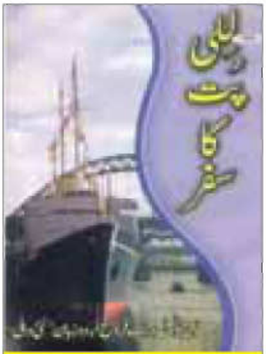

صفحات: 48، قیمت: 12 روپے

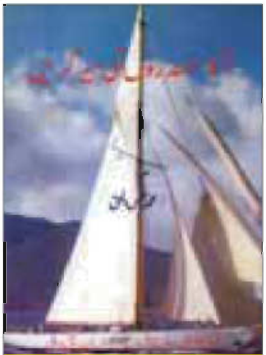
صفحات: 183، قیمت: 20 روپے

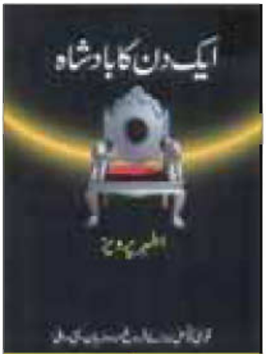

صفحات: 151، قیمت: 20 روپے

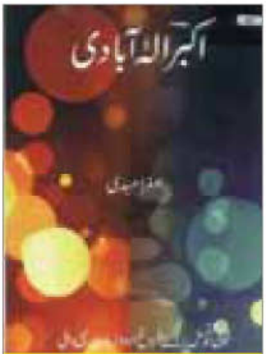

صفحات: 58، قیمت: 12 روپے

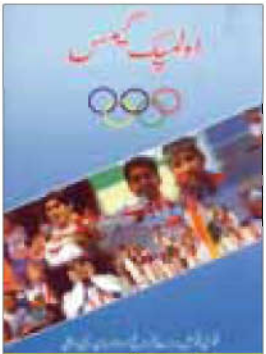

صفحات: 176، قیمت: 25 روپے

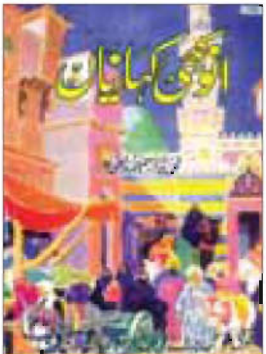

صفحات: 31، قیمت: 10 روپے

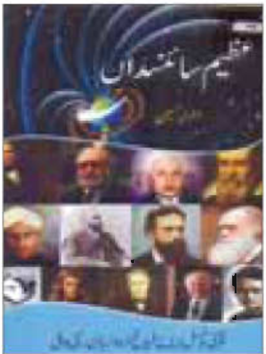

صفحات: 83، قیمت: 15 روپے

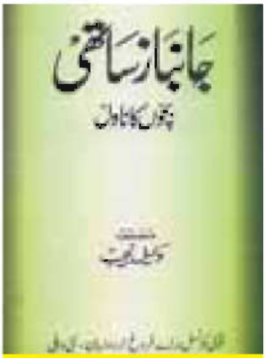

صفحات: 200، قیمت: 42 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, April 2015, Vol. 03, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL (S) - 01/3439-2013-15
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/3/15
Date of Dispatch : 12 and 13 of Advance Month

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات: 87، قیمت: 21 روپے

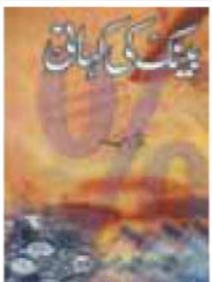

صفحات: 136، قیمت: 20 روپے

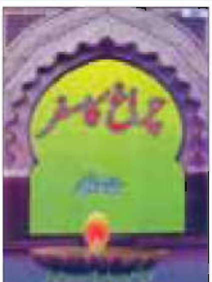

صفحات: 35، قیمت: 12 روپے

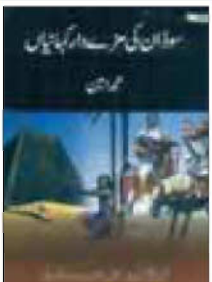

صفحات: 61، قیمت: 18 روپے

صفحات: 79، قیمت: 14 روپے

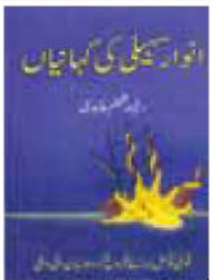

صفحات: 183، قیمت: 23 روپے

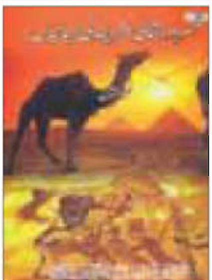

صفحات: 71، قیمت: 10 روپے

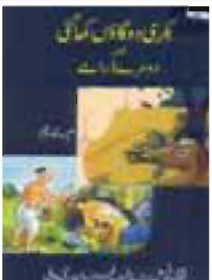

صفحات: 78، قیمت: 14 روپے

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000